

فَيَسْئَلُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ فِيهِ تَخْتَلِفُونَ ﴿۳۰﴾

وَهُوَ الَّذِي جَعَلَ لَكُمْ خَلْفَ الْأَرْضِ وَرَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ
دَرَجَاتٍ لِيُبْلِغَكُمْ فِي مَا آتَاكُمْ إِنَّ رَبَّكَ سَرِيعُ الْعِقَابِ وَإِنَّهُ
لَغَفُورٌ رَحِيمٌ ﴿۳۱﴾

سُورَةُ الْأَعْرَافِ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ ﴿۱﴾

التَّصَّ ﴿۱﴾

كِتَابٌ أَنْزَلَ إِلَيْكَ فَلَا يَكُنْ فِي صَدْرِكَ حَرَجٌ مِّنْهُ
لِتُنذِرَ بِهِ وَذِكْرَىٰ لِلْمُؤْمِنِينَ ﴿۲﴾

ہے اور کوئی کسی دوسرے کا بوجھ نہ اٹھائے گا۔^(۱) پھر تم
سب کو اپنے رب کی پاس جانا ہو گا۔ پھر وہ تم کو جتلائے گا
جس جس چیز میں تم اختلاف کرتے تھے۔^(۲) (۱۶۴)
اور وہ ایسا ہے جس نے تم کو زمین میں خلیفہ بنایا^(۳) اور
ایک کا دوسرے پر رتبہ بڑھایا تاکہ تم کو آزمائے ان
چیزوں میں جو تم کو دی ہیں۔^(۴) بالیقین آپ کا رب جلد
سزا دینے والا ہے اور بالیقین وہ واقعی بڑی مغفرت کرنے
والا مہربانی کرنے والا ہے۔ (۱۶۵)

سورۃ اعراف مکی ہے اس میں دو سو چھ آیتیں اور
چوبیس رکوع ہیں

شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم
والا ہے۔

المص۔ (۱)

یہ ایک کتاب ہے جو آپ کے پاس اس لئے بھیجی گئی ہے
کہ آپ اس کے ذریعہ سے ڈرائیں، سو آپ کے دل
میں اس سے بالکل تنگی نہ ہو^(۵) اور نصیحت ہے ایمان

مشرکین اس کی ربوبیت کو تو مانتے تھے۔ اور اس میں کسی کو شریک نہیں گردانتے تھے لیکن اس کی الوہیت میں شریک
ٹھہراتے تھے۔

(۱) یعنی اللہ تعالیٰ عدل و انصاف کا پورا اہتمام فرمائے گا اور جس نے۔ اچھا یا برا۔ جو کچھ کیا ہو گا، اس کے مطابق جزا و
سزا دے گا، نیکی پر اچھی جزا اور بدی پر سزا دے گا اور اور ایک کا بوجھ دوسرے پر نہیں ڈالے گا۔

(۲) اس لیے اگر تم اس دعوت توحید کو نہیں مانتے جو تمام انبیاء کی مشترکہ دعوت رہی ہے تو تم اپنا کام کیے جاؤ، ہم اپنا کیے
جاتے ہیں۔ قیامت والے دن اللہ کی بارگاہ میں ہی ہمارا تمہارا فیصلہ ہو گا۔

(۳) یعنی حکمران بنا کر اختیارات سے نوازا۔ یا ایک کے بعد دوسرے کو اس کا وارث (خلیفہ) بنایا۔

(۴) یعنی فقرو غنا، علم و جمل، صحت اور بیماری، جس کو جو کچھ دیا ہے، اسی میں اس کی آزمائش ہے۔

(۵) یعنی اس کے ابلاغ سے آپ کا دل تنگ نہ ہو کہ کہیں کافر میری تکذیب نہ کریں اور مجھے ایذا نہ پہنچائیں اس لئے

والوں کے لئے۔ (۲)

تم لوگ اس کا اتباع کرو جو تمہارے رب کی طرف سے آئی ہے (۱) اور اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر من گھڑت سرپرستوں کی اتباع مت کرو تم لوگ بہت ہی کم نصیحت پکڑتے ہو۔ (۳)

اور بہت بستیوں کو ہم نے تباہ کر دیا اور ان پر ہمارا عذاب رات کے وقت پہنچایا ایسی حالت میں کہ وہ دوپہر کے وقت آرام میں تھے۔ (۴)

سو جس وقت ان پر ہمارا عذاب آیا اس وقت ان کے منہ سے بجز اس کے اور کوئی بات نہ نکلی کہ واقعی ہم ظالم تھے۔ (۵)

پھر ہم ان لوگوں سے ضرور پوچھیں گے جن کے پاس پیغمبر بھیجے گئے تھے اور ہم پیغمبروں سے ضرور پوچھیں گے۔ (۶)

اتَّبِعُوا مَا أُنزِلَ إِلَيْكُمْ مِنْ رَبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوا مِنْ دُونِهِ أَوْلِيَاءَ قَلِيلًا مَّا تَذَكَّرُونَ ﴿۲﴾

وَكَمْ مِنْ قَرْيَةٍ أَهْلَكْنَاهَا فَجَاءَهَا بَأْسُنَا بَيَاتًا أَوْ هُمْ قَائِلُونَ ﴿۳﴾

فَمَا كَانَ دَعْوَاهُمْ إِذْ جَاءَهُمْ بَأْسُنَا إِلَّا أَنْ قَالُوا إِنَّا كُنَّا ظَالِمِينَ ﴿۴﴾

فَلَنَسْأَلَنَّ الَّذِينَ أُرْسِلَ إِلَيْهِمْ وَلَنَسْأَلَنَّ الْمُرْسَلِينَ ﴿۵﴾

کہ اللہ آپ کا حافظ و ناصر ہے یا حرج شک کے معنی میں ہے یعنی اس کے منزل من اللہ ہونے کے بارے میں آپ اپنے سینے میں شک محسوس نہ کریں۔ یہ نبی بطور تعریض ہے اور اصل مخاطب امت ہے کہ وہ شک نہ کرے۔

(۱) جو اللہ کی طرف سے نازل کیا گیا ہے یعنی قرآن اور جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یعنی حدیث، کیونکہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ”میں قرآن اور اس کی مثل اس کے ساتھ دیا گیا ہوں۔“ ان دونوں کا اتباع ضروری ہے۔ ان کے علاوہ کسی کا اتباع ضروری نہیں بلکہ ان کا انکار لازمی ہے۔ جیسا کہ اگلے فقرے میں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر دوسروں کی پیروی مت کرو۔ جس طرح زمانہ جاہلیت میں سرداروں اور نجومیوں کا ہنوں کی بات کو ہی اہمیت دی جاتی تھی کہ حلال و حرام میں بھی ان کو سند تسلیم کیا جاتا تھا۔

(۲) قَائِلُونَ قَبْلُولَةٌ سے ہے، جو دوپہر کے وقت استراحت (آرام کرنے) کو کہا جاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہمارا عذاب اچانک ایسے وقتوں میں آیا جب وہ آرام و راحت کے لئے بے خبر بستروں میں آسودہ خواب تھے۔

(۳) لیکن عذاب آجانے کے بعد ایسے اعتراف کا کوئی فائدہ نہیں۔ جیسا کہ پہلے وضاحت گذر چکی ہے ﴿فَكَذَّبْتَ وَيَنْفَعُكُمْ إِيمَانُكُمْ لَمَّا آذَابْنَا سَاءًا﴾ (المؤمن - ۸۵) جب انہوں نے ہمارا عذاب دیکھ لیا تو اس وقت ان کا ایمان لانا ان کے لئے نفع مند نہیں ہوا۔“

(۴) امتوں سے یہ پوچھا جائے گا کہ تمہارے پاس پیغمبر آئے تھے؟ انہوں نے تمہیں ہمارا پیغام پہنچایا تھا؟ وہاں وہ جواب

پھر ہم چونکہ پوری خبر رکھتے ہیں ان کے روبرو بیان کر دیں گے۔^(۱) اور ہم کچھ بے خبر نہ تھے۔ (۷)
 اور اس روز وزن بھی برحق ہے پھر جس شخص کا پلا بھاری ہو گا سو ایسے لوگ کامیاب ہوں گے۔ (۸)
 اور جس شخص کا پلا ہلکا ہو گا سو یہ وہ لوگ ہوں گے جنہوں نے اپنا نقصان کر لیا بسبب اس کے کہ ہماری آیتوں کے ساتھ ظلم کرتے تھے۔^(۲) (۹)
 اور بے شک ہم نے تم کو زمین پر رہنے کی جگہ دی اور ہم نے تمہارے لئے اس میں سامان رزق پیدا کیا، تم لوگ بہت ہی کم شکر کرتے ہو۔ (۱۰)
 اور ہم نے تم کو پیدا کیا،^(۳) پھر ہم ہی نے تمہاری

فَلَنَقُصَّنَّ عَلَيْهِمْ بِعِلْمِهِ وَمَا كُنَّا غَائِبِينَ ①
 وَالْوَزْنُ يَوْمَئِذٍ بِالْحَقِّ فَمَنْ تَقَلَّتْ مَوَازِينُهُ فَأُولَئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ②
 وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِينُهُ فَأُولَئِكَ الَّذِينَ خَسِرُوا أَنفُسَهُمْ بِمَا كَانُوا يَأْتِينَ بِالظُّلْمِ ③
 وَلَقَدْ مَكَّنَّاكُمْ فِي الْأَرْضِ وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيهَا مَعَايِشَ قَلِيلًا مَّا تَشْكُرُونَ ④
 وَلَقَدْ خَلَقْنَاكُمْ ثُمَّ صَوَّرْنَاكُمْ ثُمَّ قُلْنَا لِلْمَلَائِكَةِ اسْجُدُوا

دیں گے کہ ہاں! یا اللہ تیرے پیغمبر تو یقیناً ہمارے پاس آئے تھے لیکن ہماری ہی قسمت پھوٹی تھی کہ ہم نے ان کی پروا نہیں کی اور پیغمبروں سے پوچھا جائے گا کہ تم نے ہمارا پیغام اپنی امتوں کو پہنچایا تھا؟ اور انہوں نے اس کے مقابلے میں کیا رویہ اختیار کیا؟ پیغمبر اس سوال کا جواب دیں گے۔ جس کی تفصیل قرآن مجید کے مختلف مقامات پر موجود ہے۔

(۱) چونکہ ہر ظاہر اور پوشیدہ بات کا علم رکھتے ہیں اس لئے ہم پھر دونوں (امتوں اور پیغمبروں) کے سامنے ساری باتیں بیان کریں گے اور جو جو کچھ انہوں نے کیا ہو گا، ان کے سامنے رکھ دیں گے۔

(۲) ان آیات میں وزن اعمال کا مسئلہ بیان کیا گیا ہے جو قیامت والے دن ہو گا اور جسے قرآن کریم میں بھی متعدد جگہ اور احادیث میں بھی بیان کیا گیا ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ ترازو میں اعمال تولے جائیں گے، جس کا نیکوں والا پلڑا بھاری ہو گا، وہ کامیاب ہو گا اور جس کا بدیوں والا پلڑا بھاری ہو گا، وہ ناکام ہو گا۔ یہ اعمال کس طرح تولے جائیں گے جب کہ یہ اعراض ہیں یعنی ان کا ظاہری وجود اور جسم نہیں ہے؟ اس بارے میں ایک رائے تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ قیامت والے دن ان کو اجسام میں تبدیل فرمادے گا اور ان کا وزن ہو گا۔ دوسری رائے یہ ہے کہ وہ صحیفے اور رجسٹر تولے جائیں گے جن میں انسان کے اعمال درج ہوں گے۔ تیسری رائے یہ ہے کہ خود صاحب عمل کو تولا جائے گا۔ تینوں مسلکوں والوں کے پاس اپنے مسلک کی حمایت میں صحیح احادیث و آثار موجود ہیں، اس لئے امام ابن کثیر فرماتے ہیں کہ تینوں ہی باتیں صحیح ہو سکتی ہیں ممکن ہے کبھی اعمال، کبھی صحیفے اور کبھی صاحب عمل کو تولا جائے (دلائل کے لئے دیکھئے تفسیر ابن کثیر) بہر حال میزان اور وزن اعمال کا مسئلہ قرآن و حدیث سے ثابت ہے۔ اس کا انکار یا اس کی تاویل گمراہی ہے۔ اور موجودہ دور میں تو اس کے انکار کی اب مزید کوئی گنجائش نہیں کہ بے وزن چیزیں بھی تولی جانے لگی ہیں۔

(۳) خَلَقْنَاكُمْ مِّنْ ضَمِيرٍ وَإِن مَّا جَمَعْنَاكُمْ لِيُعَذِّبَكُمْ لِكُلِّ فِتْنَةٍ لِّيُرِيَكُمْ أَعْمَالَكُمْ ⑤
 (۳) خَلَقْنَاكُمْ مِّنْ ضَمِيرٍ وَإِن مَّا جَمَعْنَاكُمْ لِيُعَذِّبَكُمْ لِكُلِّ فِتْنَةٍ لِّيُرِيَكُمْ أَعْمَالَكُمْ ⑤

لِإِدْرَاسِ سَجْدٍ وَالْإِبْلِيسَ لَمْ يَكُنْ مِنَ السَّاجِدِينَ ⑩

صورت بنائی پھر ہم نے فرشتوں سے کہا کہ آدم کو سجدہ کرو سو سب نے سجدہ کیا۔ جزا بلیس کے، وہ سجدہ کرنے والوں میں شامل نہ ہوا۔ (۱۱)

قَالَ مَا مَنَعَكَ أَلَّا تَسْجُدَ إِذْ أَمَرْتُكَ قَالَ أَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ خَلَقْتَنِي مِن نَّارٍ وَخَلَقْتَهُ مِن طِينٍ ⑪

حق تعالیٰ نے فرمایا تو جو سجدہ نہیں کرتا تو تجھ کو اس سے کون امر مانع ہے، (۱۱) جبکہ میں تجھ کو حکم دے چکا، کہنے لگا میں اس سے بہتر ہوں، آپ نے مجھ کو آگ سے پیدا کیا ہے اور اس کو آپ نے خاک سے پیدا کیا ہے۔ (۱۲) (۱۳)

قَالَ فَأَهْبِطْ مِنْهَا قَائِمًا لَّيُونَ لَكَ أَنْ تَتَكَبَّرَ فِيهَا فَاخْرُجْ إِنَّكَ

(۱) أَلَّا تَسْجُدَ میں لا زائد ہے یعنی أَنْ تَسْجُدَ (تجھے سجدہ کرنے سے کس نے روکا؟) یا عبارت محذوف ہے یعنی ”تجھے کس چیز نے اس بات پر مجبور کیا کہ تو سجدہ نہ کرے“ (ابن کثیر و فتح القدر) شیطان، فرشتوں میں سے نہیں تھا، بلکہ خود قرآن کی صراحت کے بموجب وہ جنات میں سے تھا۔ (الکھف: ۵۰) لیکن آسمان پر فرشتوں کے ساتھ رہنے کی وجہ سے اس سجدہ حکم میں شامل تھا جو اللہ نے فرشتوں کو دیا تھا۔ اسی لئے اس سے باز پرس بھی ہوئی اور اس پر عتاب بھی نازل ہوا۔ اگر وہ اس حکم میں شامل ہی نہ ہوتا تو اس سے باز پرس ہوتی نہ وہ راندہ درگاہ قرار پاتا۔

(۲) شیطان کا یہ عذر ”عذر گناہ بدتر از گناہ“ کا آئینہ دار ہے۔ ایک تو اس کا یہ سمجھنا کہ افضل کو مفضول کی تعظیم کا حکم نہیں دیا جاسکتا، غلط ہے۔ اس لئے کہ اصل چیز تو اللہ کا حکم ہے، اس کے حکم کے مقابلے میں افضل وغیر افضل کی بحث اللہ سے سر تابی ہے۔ دوسرے، اس نے بہتر ہونے کی دلیل یہ دی کہ میں آگ سے پیدا ہوا ہوں اور یہ مٹی سے۔ لیکن اس نے اس شرف و عظمت کو نظر انداز کر دیا جو حضرت آدم علیہ السلام کو حاصل ہوا کہ اللہ نے انہیں اپنے ہاتھ سے بنایا اور اپنی طرف سے اس میں روح پھونکی۔ اس شرف کے مقابلے میں دنیا کی کوئی چیز بھی ہو سکتی ہے؟ تیسرا، نص کے مقابلے میں قیاس سے کام لیا، جو کسی بھی اللہ کو ماننے والے کا شیوہ نہیں ہو سکتا۔ علاوہ ازیں اس کا قیاس بھی قیاس فاسد تھا۔ آگ، مٹی سے کس طرح بہتر ہے؟ آگ میں سوائے تیزی، بھڑکنے اور جلانے کے کیا ہے؟ جب کہ مٹی میں سکون اور ثبات ہے، اس میں نبات و نمو، زیادتی اور اصلاح کی صلاحیت ہے۔ یہ صفات آگ سے بہر حال بہتر اور زیادہ مفید ہیں۔ اس آیت سے یہ معلوم ہوا کہ شیطان کی تخلیق آگ سے ہوئی۔ جیسا کہ حدیث میں بھی آتا ہے کہ ”فرشتے نور سے، ابلیس آگ کی لپٹ سے اور آدم علیہ السلام مٹی سے پیدا کئے گئے ہیں۔“ (صحیح مسلم کتاب الزہد، باب فی احادیث متفرقة)

(۳) مِنْهَا کی ضمیر کا مرجع اکثر مفسرین نے جنت کو قرار دیا ہے اور بعض نے اس مرتبہ کو جو ملکوت اعلیٰ میں اسے حاصل تھا۔ فاضل مترجم نے اسی دوسرے مفہوم کے مطابق آسمان ترجمہ کیا ہے۔

حاصل نہیں کہ تو آسمان میں رہ کر تکبر کرے سو نکل بے شک تو ذیلیوں میں سے ہے۔ (۱۳)^(۱)

اس نے کہا کہ مجھ کو مہلت دیجئے قیامت کے دن تک۔ (۱۳)

اللہ تعالیٰ نے فرمایا تجھ کو مہلت دی گئی۔ (۱۵)^(۲)

اس نے کہا بسبب اس کے کہ آپ نے مجھ کو گمراہ کیا ہے (۳) میں قسم کھاتا ہوں کہ میں ان کے لئے آپ کی سیدھی راہ پر بیٹھوں گا۔ (۱۶)

پھر ان پر حملہ کروں گا ان کے آگے سے بھی اور ان کے پیچھے سے بھی اور ان کی داہنی جانب سے بھی اور ان کی بائیں جانب سے بھی (۳) اور آپ ان میں سے اکثر کو شکر گزار نہ پائیے گا۔ (۱۷)^(۵)

اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہاں سے ذلیل و خوار ہو کر نکل جا جو شخص ان میں سے تیرا کہنا مانے گا میں ضرور تم سب سے جہنم کو بھر دوں گا۔ (۱۸)

مِنَ الصَّغِيرِينَ ⑩

قَالَ أَنْظِرْنِي إِلَى يَوْمِ يُبْعَثُونَ ⑪

قَالَ إِنَّكَ مِنَ الْمُنظَرِينَ ⑫

قَالَ يَا أَغْوَيْتَنِي لَأَقْعُدَنَّ لَهُمْ صِرَاطَكَ الْمُسْتَقِيمَ ⑬

ثُمَّ لَآتِيَنَّهُمْ مِنْ بَيْنِ أَيْدِيهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ وَعَنْ أَيْمَانِهِمْ وَعَنْ شَمَائِلِهِمْ وَلَا تَجِدُ أَكْثَرَهُمْ شَاكِرِينَ ⑭

قَالَ اخْرُجْ مِنْهَا مَذْمُومًا مَدْحُورًا لَمَنْ يَبْعَكَ مِنْهُمْ لَأَمْلَأَنَّ جَهَنَّمَ مِنْكُمْ أَجْمَعِينَ ⑮

(۱) اللہ کے حکم کے مقابلے میں تکبر کرنے والا احترام و تعظیم کا نہیں، ذلت و خواری کا مستحق ہے۔

(۲) اللہ تعالیٰ نے اس کی خواہش کے مطابق اسے مہلت عطا فرمادی جو اس کی حکمت، ارادے اور مشیت کے مطابق تھی جس کا پورا علم اسی کو ہے۔ تاہم ایک حکمت یہ نظر آتی ہے کہ اس طرح اپنے بندوں کی وہ آزمائش کر سکے گا کہ کون رحمان کا بندہ بنتا ہے اور کون شیطان کا بیچارہ؟

(۳) گمراہ تو وہ اللہ کی تکوینی مشیت کے تحت ہوا۔ لیکن اس نے اسے بھی مشرکوں کی طرح الزام بنالیا، جس طرح وہ کہتے تھے کہ اگر اللہ چاہتا تو ہم شرک نہ کرتے۔

(۴) مطلب یہ ہے کہ ہر خیر اور شر کے راستے پر میں بیٹھوں گا۔ خیر سے ان کو روکوں گا اور شر کو ان کی نظروں میں پسندیدہ بنا کر ان کو اختیار کرنے کی ترغیب دوں گا۔

(۵) شاکرین کے دوسرے معنی مَوْحِدِينَ کے کئے گئے ہیں۔ یعنی اکثر لوگوں کو میں شرک میں مبتلا کر دوں گا۔ شیطان

نے اپنا یہ گمان فی الواقع سچا کر دکھایا ﴿وَلَقَدْ صَدَقَ عَلَيْهِمْ إِلَيْسَ ظَنُّهُ فَاتَّبَعُوهُ إِلَّا تَفِيئَاتٍ مِّنَ الْمُؤْمِنِينَ﴾ (سورۃ سبأ: ۲۰) ”شیطان نے اپنا گمان سچا کر دکھایا“ اور مومنوں کے ایک گروہ کو چھوڑ کر سب لوگ اس کے پیچھے لگ گئے۔“

اسی لئے احادیث میں شیطان سے پناہ مانگنے کی اور قرآن میں اس کے مکر و کید سے بچنے کی بڑی تاکید آئی ہے۔

اور ہم نے حکم دیا کہ اے آدم! تم اور تمہاری بیوی جنت میں رہو۔ پھر جس جگہ سے چاہو دونوں کھاؤ اور اس درخت کے پاس مت جاؤ^(۱) ورنہ تم دونوں ظالموں میں سے ہو جاؤ گے۔ (۱۹)

پھر شیطان نے ان دونوں کے دلوں میں وسوسہ^(۲) ڈالا تاکہ ان کی شرمگاہیں جو ایک دوسرے سے پوشیدہ تھیں دونوں کے روبرو بے پردہ^(۳) کر دے اور کہنے لگا کہ تمہارے رب نے تم دونوں کو اس درخت سے اور کسی سبب سے منع نہیں فرمایا، مگر محض اس وجہ سے کہ تم دونوں کہیں فرشتے ہو جاؤ یا کہیں ہمیشہ زندہ رہنے والوں میں سے ہو جاؤ۔ (۲۰) اور ان دونوں کے روبرو قسم کھالی کہ یقین جانیئے میں تم دونوں کا خیر خواہ ہوں۔^(۴) (۲۱)

سو ان دونوں کو فریب سے نیچے^(۵) لے آیا پس ان

وَيَادِمُ اسْكُنْ أَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ فَكُلَا مِنْ حَيْثُ شِئْتُمَا وَلَا تَقْرَبَا هَذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُونَا مِنَ الظَّالِمِينَ ﴿۱۹﴾

فَوَسْوَسَ لَهُمَا الشَّيْطَانُ لِيُبْدِيَ لَهُمَا نَافِرِهِمَا مِنْ سَوَائِهِمَا وَقَالَ مَا نَهَاكُمَا رَبُّكُمَا عَنْ هَذِهِ الشَّجَرَةِ إِلَّا أَنْ تَكُونَا مَلَائِكَةً أَوْ تَكُونَا مِنَ الْخَالِدِينَ ﴿۲۰﴾

وَقَالَهُمَا إِنِّي لَكُمَا مِنَ النَّاصِحِينَ ﴿۲۱﴾

فَذَلَّلَهُمَا بِغُرُورٍ فَلَمَّا ذَاقَا الشَّجَرَةَ بَدَتْ لَهُمَا سَوْآتُهُمَا وَطَفِقَا

(۱) یعنی صرف اس ایک درخت کو چھوڑ کہ جہاں سے اور جتنا چاہو، کھاؤ۔ ایک درخت کا پھل کھانے کی پابندی آزمائش کے طور پر عائد کر دی۔

(۲) وَسْوَسَةٌ اور وسوساؤں زکزلت اور زلزالت کے وزن پر ہے۔ پست آواز اور نفس کی بات۔ شیطان دل میں جو بری باتیں ڈالتا ہے، اس کو وسوسہ کہا جاتا ہے۔

(۳) یعنی شیطان کا مقصد اس برکاوے سے حضرت آدم و حوا کو اس لباس جنت سے محروم کر کے انہیں شرمندہ کرنا تھا، جو انہیں جنت میں پہننے کے لئے دیا گیا تھا سَوَاتٌ، سَوَاءٌ (شرم گاہ) کی جمع ہے۔ شرم گاہ کو سَوَاءٌ سے اس لئے تعبیر کیا گیا ہے کہ اس کے ظاہر ہونے کو برا سمجھا جاتا ہے۔

(۴) جنت کی جو نعمتیں اور آسائشیں حضرت آدم علیہ السلام و حوا کو حاصل تھیں، اس کے حوالے سے شیطان نے دونوں کو ہسلایا اور یہ جھوٹ بولا کہ اللہ تمہیں ہمیشہ جنت میں رکھنا نہیں چاہتا، اسی لئے اس درخت کا پھل کھانے سے منع فرمایا ہے کیونکہ اس کی تاثیر ہی یہ ہے کہ جو اسے کھالیتا ہے، وہ فرشتہ بن جاتا ہے یا دائمی زندگی اسے حاصل ہو جاتی ہے پھر قسم کھا کر اپنا خیر خواہ ہونا بھی ظاہر کیا، جس سے حضرت آدم علیہ السلام و حوا متاثر ہو گئے اس لئے کہ اللہ والے، اللہ کے نام پر آسانی سے دھوکہ کھا جاتے ہیں۔

(۵) تَذْلِيَةً اور إذلاء کے معنی ہیں کسی چیز کو اوپر سے نیچے چھوڑ دینا۔ گویا شیطان ان کو مرتبہ علیا سے اتار کر ممنوعہ درخت کا پھل کھانے تک لے آیا۔

دونوں نے جب درخت کو چکھا دونوں کی شرمگاہیں ایک دوسرے کے روبرو بے پردہ ہو گئیں اور دونوں اپنے اوپر جنت کے پتے جوڑ جوڑ کر رکھنے لگے^(۱) اور ان کے رب نے ان کو پکارا کیا میں تم دونوں کو اس درخت سے منع نہ کر چکا تھا اور یہ نہ کہہ چکا کہ شیطان تمہارا صریح دشمن ہے؟۔^(۲) (۲۲)

دونوں نے کہا اے ہمارے رب! ہم نے اپنا بڑا نقصان کیا اور اگر تو ہماری مغفرت نہ کرے گا اور ہم پر رحم نہ کرے گا تو واقعی ہم نقصان پانے والوں میں سے ہو جائیں گے۔^(۳) (۲۳)

حق تعالیٰ نے فرمایا کہ نیچے ایسی حالت میں جاؤ کہ تم باہم ایک دوسرے کے دشمن ہو گے اور تمہارے واسطے

يَخْتَصِمِينَ عَلَيْهَا مِنْ وَرَقِ الْجَنَّةِ وَنَادَاهُمَا اللَّهُ أَنهَمَا
عَنِ تِلْكَ الشَّجَرَةِ وَأَقْلَمَ لِكُلِّمَانِ الشَّيْطَانِ لِكُلِّمَاعِدُوْمُبِينٍ ۝۲۲

قَالَارَبَّنَا ظَلَمْنَا أَنفُسَنَا وَإِن لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُونَنَّ مِنَ
الْخٰسِرِيْنَ ۝۲۳

قَالَ اهْبِطُوا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ وَلَكُمْ فِي الْأَرْضِ

(۱) یہ اس معصیت کا اثر ظاہر ہوا جو آدم علیہ السلام وحواء سے غیر شعوری اور غیر ارادی طور پر ہوئی اور پھر دونوں مارے شرم کے جنت کے پتے جوڑ جوڑ کر اپنی شرم گاہ چھپانے لگے۔ وہب بن منبہ کہتے ہیں کہ اس سے قبل انہیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک ایسا نورانی لباس ملا ہوا تھا جو اگرچہ غیر مرئی تھا لیکن ایک دوسرے کی شرم گاہ کے لئے ساتر (پردہ پوش) تھا۔ (ابن کثیر)

(۲) یعنی اس تنبیہ کے باوجود تم شیطان کے وسوسوں کا شکار ہو گئے۔ اس سے معلوم ہوا کہ شیطان کے جال بڑے حسین اور دلفریب ہوتے ہیں اور جن سے بچنے کے لئے بڑی کاوش و محنت اور ہر وقت اس سے چوکنار ہونے کی ضرورت ہے۔

(۳) توبہ و استغفار کے یہ وہی کلمات ہیں جو حضرت آدم علیہ السلام نے اللہ تبارک و تعالیٰ سے سیکھے، جیسا کہ سورہ بقرہ، آیت ۳۷ میں صراحت ہے (دیکھئے آیت مذکورہ کا حاشیہ) گویا شیطان نے اللہ کی نافرمانی کا ارتکاب کیا تو اس کے بعد وہ اس پر نہ صرف اڑ گیا بلکہ اس کے جواز و اثبات میں عقلی و قیاسی دلائل دینے لگا۔ نتیجتاً وہ راندہ درگاہ اور ہمیشہ کے لئے ملعون قرار پایا اور حضرت آدم علیہ السلام نے اپنی غلطی پر ندامت و پشیمانی کا اظہار اور بارگاہ الہی میں توبہ و استغفار کا اہتمام کیا۔ تو اللہ کی رحمت و مغفرت کے مستحق قرار پائے۔ یوں گویا دونوں راستوں کی نشان دہی ہو گئی، شیطانی راستے کی بھی اور اللہ والوں کے راستے کی بھی۔ گناہ کر کے اس پر اترانا، اصرار کرنا اور اس کو صحیح ثابت کرنے کے لئے ”دلائل“ کے انبار فراہم کرنا، شیطانی راستہ ہے۔ اور گناہ کے بعد احساس ندامت سے مغلوب ہو کر بارگاہ الہی میں جھک جانا اور توبہ و استغفار کا اہتمام کرنا، بندگان الہی کا راستہ ہے۔ اللّٰهُمَّ! اجْعَلْنَا مِنْهُمْ.

مُسْتَقَرًّا وَمَتَاعًا إِلَىٰ حِينٍ ﴿۲۴﴾

زمین میں رہنے کی جگہ ہے اور نفع حاصل کرنا ہے ایک وقت تک۔ (۲۴)

فرمایا تم کو وہاں ہی زندگی بسر کرنا ہے اور وہاں ہی مرنا ہے اور اسی میں سے پھر نکالے جاؤ گے۔ (۲۵)

اے آدم (علیہ السلام) کی اولاد ہم نے تمہارے لئے لباس پیدا کیا جو تمہاری شرم گاہوں کو بھی چھپاتا ہے اور موجب زینت بھی ہے ^(۱) اور تقوے کا لباس ^(۲)، یہ اس سے بڑھ کر ہے۔ ^(۳) یہ اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے ہے تاکہ یہ لوگ یاد رکھیں۔ (۲۶)

اے اولاد آدم! شیطان تم کو کسی خرابی میں نہ ڈال دے جیسا اس نے تمہارے ماں باپ کو جنت سے باہر کر دیا ایسی حالت میں ان کا لباس بھی اترا دیا تاکہ وہ ان کو ان کی شرم گاہیں دکھائے۔ وہ اور اس کا لشکر تم کو ایسے طور پر دیکھتا ہے کہ تم ان کو نہیں دیکھتے ہو۔ ^(۴) ہم نے

قَالَ فِيهَا تَحْيَوْنَ وَفِيهَا تَمُوتُونَ وَمِنْهَا تُخْرَجُونَ ﴿۲۵﴾

يَبْنِيْ اٰدَمَ قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ لِبَاسًا يُواوِيْ سَوَاتِيْكُمْ وَرِيْشًا وَلِبَاسَ التَّقْوٰى ذٰلِكَ خَيْرٌ ذٰلِكَ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ لَعَلَّكُمْ يَذَكَّرُوْنَ ﴿۲۶﴾

يَبْنِيْ اٰدَمَ لَا يَفْتِنَنَّكُمُ الشَّيْطٰنُ كَمَا اَخْرَجَ اٰبَوَيْكُمْ مِنَ الْجَنَّةِ يَنْزِعُ عَنْهُمَا لِبَاسَهُمَا لِيُرِيَهُمَا سَوَاتِيْهَا اِنَّهٗ يَرِيْكُمْ هُوَ وَقَبِيْلُهٗ مِنْ حَيْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ اِنَّا جَعَلْنَا الشَّيْطٰنَ اَوْلِيَاً لِلَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۲۷﴾

(۱) سَوَاتٍ، جسم کے وہ حصے جنہیں چھپانا ضروری ہے۔ جیسے شرم گاہ اور ریشا وہ لباس جو حسن و رعنائی کے لئے پہنا جائے۔ گویا لباس کی پہلی قسم ضروریات سے اور دوسری قسم تکملہ و اضافہ سے ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان دونوں قسموں کے لباس کے لئے سامان اور مواد پیدا فرمایا۔

(۲) اس سے مراد بعض کے نزدیک وہ لباس ہے جو متقین قیامت والے دن پہنیں گے۔ بعض کے نزدیک ایمان، بعض کے نزدیک عمل صالح، خشیت الہی وغیرہ ہیں۔ مفہوم سب کا تقریباً ایک ہے کہ ایسا لباس جسے پہن کر انسان تکبر کرنے کے بجائے اللہ سے ڈرے اور ایمان و عمل صالح کے تقاضوں کا اہتمام کرے۔

(۳) اس سے یہ مفہوم بھی نکلتا ہے کہ زیب و زینت اور آرائش کے لئے بھی اگرچہ لباس پہننا جائز ہے۔ تاہم لباس میں ایسی سادگی زیادہ پسندیدہ ہے جو انسان کے زہد و ورع اور تقویٰ کی مظہر ہو۔ علاوہ ازیں نیا لباس پہن کر یہ دعا بھی پڑھی جائے، کیونکہ نبی ﷺ یہ دعا پڑھا کرتے تھے «الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ كَسَانِيْ مَا اُوَارِيْ بِهٖ عَوْرَتِيْ وَانْجَمَلُ بِهٖ فِيْ حَيَاتِيْ» (ترمذی، ابواب الدعوات۔ ابن ماجہ، کتاب اللباس، باب ما يقول الرجل اذا لبس ثوبا جديداً) تمام تعریفیں اس اللہ کے لئے ہیں جس نے مجھے ایسا لباس پہنایا جس سے میں اپنا ستر چھپالوں اور اپنی زندگی میں اس سے زینت حاصل کروں۔

(۴) اس میں اہل ایمان کو شیطان اور اس کے قبیلے یعنی چیلے چانٹوں سے ڈرایا گیا ہے کہ کہیں وہ تمہاری غفلت اور

شیطانوں کو ان ہی لوگوں کا دوست بنایا ہے جو ایمان نہیں لاتے۔^(۱) (۲۷)

اور وہ لوگ جب کوئی فحش کام کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم نے اپنے باپ دادا کو اسی طریق پر پایا ہے اور اللہ نے بھی ہم کو یہی بتایا ہے۔ آپ کہہ دیجئے کہ اللہ تعالیٰ فحش بات کی تعلیم نہیں دیتا، کیا اللہ کے ذمہ ایسی بات لگاتے ہو جس کی تم سند نہیں رکھتے؟^(۲) (۲۸)

آپ کہہ دیجئے کہ میرے رب نے حکم دیا ہے انصاف کا^(۳)

وَإِذْ أَعْلَمُوا فَالِغَنَّةَ فَلَوْ أَوَّجَدْنَا عَلَيْهِمَ آبَاءَنَا وَاللَّهُ أَمَرَنَا
بِعَمَلِهِمْ إِنَّ اللَّهَ لَأَبْلَسُ الْبَشَرِ أَفَقُولُونَ عَلَى اللَّهِ
مَا لَا تَعْلَمُونَ ﴿۲۷﴾

قُلْ أَمَرَ رَبِّي بِالْقِسْطِ وَأَقِيمُوا وُجُوهَكُمْ عِندَ كُلِّ

سستی سے فائدہ اٹھا کر تمہیں بھی اس طرح فتنے اور گمراہی میں نہ ڈال دے جس طرح تمہارے ماں باپ (آدم و حوا) کو اس نے جنت سے نکلوا دیا اور لباس جنت بھی اتروا دیا۔ بالخصوص جب کہ وہ نظر بھی نہیں آتے۔ تو اس سے بچنے کا اہتمام اور فکر بھی زیادہ ہونی چاہئے۔

(۱) یعنی بے ایمان قسم کے لوگ ہی اس کے دوست اور اس کے خاص شکار ہیں۔ تاہم اہل ایمان پر بھی وہ ڈورے ڈالتا رہتا ہے۔ کچھ اور نہیں تو شرک خفی، (ریا کاری) اور شرک جلی میں ہی ان کو مبتلا کر دیتا ہے اور یوں ان کو بھی ایمان کے بعد ایمان صحیح کی پونجی سے محروم کر دیتا ہے۔

(۲) اسلام سے قبل مشرکین بیت اللہ کا ننگا طواف کرتے تھے اور کہتے تھے کہ ہم اس حالت کو اختیار کر کے طواف کرتے ہیں جو اس وقت تھی جب ہمیں ہماری ماؤں نے جنا تھا۔ بعض کہتے ہیں کہ وہ اس کی یہ تاویل کرتے تھے کہ ہم جو لباس پہنے ہوتے ہیں اس میں ہم اللہ کی نافرمانی کرتے رہتے ہیں، اس لئے اس لباس میں طواف کرنا مناسب نہیں۔ چنانچہ وہ لباس اتار کر طواف کرتے اور عورتیں بھی ننگی طواف کرتیں، صرف اپنی شرمگاہ پر کوئی کپڑا یا چمڑے کا ٹکڑا رکھ لیتیں۔ اپنے اس شرمناک فعل کے لئے دو عذر انہوں نے اور پیش کئے۔ ایک تو یہ کہ ہم نے اپنے باپ دادوں کو اس طرح ہی کرتے پایا ہے۔ دوسرا یہ کہ اللہ نے ہمیں اس کا حکم دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی تردید فرمائی کہ یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ بے حیائی کا حکم دے؟ یعنی تم اللہ کے ذمے وہ بات لگاتے ہو جو اس نے نہیں کہی۔ اس آیت میں ان مقلدین کے لئے بڑی زبرد توخ ہے جو آبا پرستی، پیر پرستی اور شخصیت پرستی میں مبتلا ہیں، جب انہیں بھی حق کی بات بتلائی جاتی ہے تو اس کے مقابلے میں یہی عذر پیش کرتے ہیں کہ ہمارے بڑے یہی کرتے آئے ہیں یا ہمارے امام اور پیر و شیخ کا یہی حکم ہے۔ یہی وہ خصلت ہے جس کی وجہ سے یہودی، یہودیت پر، نصرانی نصرانیت پر اور بدعتی بدعتوں پر قائم رہے۔ (فتح القدیر)

(۳) انصاف سے مراد یہاں بعض کے نزدیک لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ یعنی توحید ہے۔

مَسْجِدًا وَادْعُوهُ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ ؕ كَمَا بَدَأَكُمْ تَعُودُونَ ﴿۲۹﴾

اور یہ کہ تم ہر سجدہ کے وقت اپنا رخ سیدھا رکھا کرو^(۱) اور اللہ تعالیٰ کی عبادت اس طور پر کرو کہ اس عبادت کو خالص اللہ ہی کے واسطے رکھو۔ تم کو اللہ نے جس طرح شروع میں پیدا کیا تھا اسی طرح تم دوبارہ پیدا ہو گے۔ (۲۹)

فَرِيقًا هَادِيَ وَفَرِيقًا حَقَّ عَلَيْهِمُ الضَّلَالَةُ إِنَّهُمْ اتَّخَذُوا الشَّيَاطِينَ أَوْلِيَاءَ مِنْ دُونِ اللَّهِ وَيَحْسَبُونَ أَنَّهُمْ مُّهْتَدُونَ ﴿۳۰﴾

بعض لوگوں کو اللہ نے ہدایت دی ہے اور بعض پر گمراہی ثابت ہو گئی ہے۔ ان لوگوں نے اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر شیطانوں کو دوست بنا لیا ہے اور خیال رکھتے ہیں کہ وہ راست پر ہیں۔ (۳۰)

يَذَرُوا آدَمَ حُذُوًا وَإِذْنًا عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ وَكُلُوا وَاشْرَبُوا وَلَا تُسْرِفُوا إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِينَ ﴿۳۱﴾

اے اولاد آدم! تم مسجد کی ہر حاضری کے وقت اپنا لباس پسن لیا کرو۔^(۲) اور خوب کھاؤ اور پیو اور حد سے مت نکلو۔ بے شک اللہ حد سے نکل جانے والوں کو پسند نہیں کرتا۔^(۳) (۳۱)

قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِينَةَ اللَّهِ الَّتِي أَخْرَجَ لِعِبَادِهِ وَالطَّيِّبَاتِ مِنَ

آپ فرمائیے کہ اللہ تعالیٰ کے پیدا کئے ہوئے اسباب

(۱) امام شوکانی نے اس کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ ”اپنی نمازوں میں اپنا رخ قبلے کی طرف کر لو، چاہے تم کسی بھی مسجد میں ہو“ اور امام ابن کثیر نے اس سے استقامت بمعنی متابعت رسول مراد لی ہے اور اگلے جملے سے اخلاص اللہ اور کہا ہے کہ ہر عمل کی مقبولیت کے لئے ضروری ہے کہ وہ شریعت کے مطابق ہو اور دوسرے خالص رضائے الہی کے لئے ہو۔ آیت میں ان باتوں کی تاکید کی گئی ہے۔

(۲) آیت میں زینت سے مراد لباس ہے۔ اس کا سبب نزول بھی مشرکین کے ننگے طواف سے متعلق ہے۔ اس لئے انہیں کہا گیا کہ لباس پسن کر اللہ کی عبادت کرو اور طواف کرو۔

(۳) اِسْرَافٌ (حد سے نکل جانا) کسی چیز میں حتیٰ کہ کھانے پینے میں بھی ناپسندیدہ ہے۔ ایک حدیث میں نبی ﷺ نے فرمایا ”جو چاہو، کھاؤ۔ جو چاہو، پیو! البتہ دو باتوں سے گریز کرو۔ اسراف اور تکبر سے (صحیح بخاری، کتاب اللباس، باب قول اللہ تعالیٰ قل من حرم زينة الله ...) بعض سلف کا قول ہے، اللہ تعالیٰ نے ﴿وَكُلُوا وَاشْرَبُوا وَلَا تُسْرِفُوا﴾ اس آدمی آیت میں ساری طب جمع فرمادی ہے۔ (ابن کثیر)

بعض کہتے ہیں زینت سے وہ لباس مراد ہے جو آرائش کے لئے پہنا جائے۔ جس سے ان کے نزدیک نماز اور طواف کے وقت تزئین کا حکم نکلتا ہے۔ اس آیت سے نماز میں ستر عورت کے وجوب پر بھی استدلال کیا گیا ہے بلکہ احادیث کی رو سے ستر عورت (گھٹنوں سے لے کر ناف تک کے حصے کو ڈھانپنا) ہر حال میں ضروری ہے چاہے آدمی خلوت میں ہی ہو۔ (فتح القدیر) جمعہ اور عید کے دن خوشبو کا استعمال بھی مستحب ہے کہ یہ بھی زینت کا حصہ ہے۔ (ابن کثیر)

الْبُزْقِ قُلْ هِيَ لِلَّذِينَ آمَنُوا فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا خَالِصَةٌ
يَوْمَ الْقِيَامَةِ كَذَلِكَ نُفَصِّلُ الْآيَاتِ لِقَوْمٍ يَعْلَمُونَ ﴿۳۲﴾

زینت کو، جن کو اس نے اپنے بندوں کے واسطے بنایا ہے اور کھانے پینے کی حلال چیزوں کو کس شخص نے حرام کیا ہے؟ آپ کہہ دیجئے کہ یہ اسیا اس طور پر کہ قیامت کے روز خالص ہوں گی اہل ایمان کے لئے، دنیوی زندگی میں مومنوں کے لئے بھی ہیں۔^(۱) ہم اسی طرح تمام آیات کو سمجھ داروں کے واسطے صاف صاف بیان کرتے ہیں۔ (۳۲)

آپ فرمائیے کہ البتہ میرے رب نے صرف حرام کیا ہے ان تمام فحش باتوں کو جو علانیہ ہیں^(۲) اور جو پوشیدہ ہیں اور ہر گناہ کی بات کو اور ناحق کسی پر ظلم کرنے کو^(۳) اور

قُلْ إِنَّمَا حَرَّمَ رِيقَ الْفَوَاحِشِ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَّنَ ۖ وَإِذْ
وَالْبَغْيِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَأَنْ تُشْرِكُوا بِاللَّهِ مَا لَمْ يُنَزَّلْ بِهِ سُلْطَانًا

(۱) مشرکین نے جس طرح طواف کے وقت لباس پہننے کو ناپسندیدہ قرار دے رکھا تھا، اسی طرح بعض حلال چیزیں بھی بطور تقرب الہی اپنے اوپر حرام کر لی تھیں (جیسا کہ بعض صوفیا بھی ایسا کرتے ہیں) نیز بہت سی حلال چیزیں اپنے بتوں کے نام وقف کر دینے کی وجہ سے حرام گردانتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا لوگوں کی زینت کے لئے (مثلاً لباس وغیرہ) اور کھانے کی عمدہ چیزیں بنائی ہیں، انہیں کون حرام کرنے والا ہے؟ مطلب یہ ہے کہ لوگوں کے حرام کر لینے سے اللہ کی حلال کردہ چیزیں حرام نہیں ہو جائیں گی، وہ حلال ہی رہیں گی۔ یہ حلال و طیب چیزیں اصلاً اللہ نے اہل ایمان ہی کے لئے بنائی ہیں۔ گو کفار بھی ان سے فیض یاب اور متمتع ہو لیتے ہیں بلکہ بعض دفعہ دنیوی چیزوں اور آسائشوں کے حصول میں وہ مسلمانوں سے زیادہ کامیاب نظر آتے ہیں لیکن یہ باہتج اور عارضی ہے جس میں اللہ تعالیٰ کی تکوینی مشیت اور حکمت ہے۔ تاہم قیامت والے دن یہ نعمتیں صرف اہل ایمان کے لئے ہوں گی کیونکہ کافروں پر جس طرح جنت حرام ہوگی، اسی طرح ماکولات و مشروبات بھی حرام ہوں گے۔

(۲) علانیہ فحش باتوں سے مراد بعض کے نزدیک طوائفوں کے اڈوں پر جا کر بدکاری اور پوشیدہ سے مراد کسی ”گرل فرینڈ“ سے خصوصی تعلق قائم کرنا ہے۔ بعض کے نزدیک اول الذکر سے مراد محرموں سے نکاح کرنا ہے جو ممنوع ہے۔ صحیح بات یہ ہے کہ یہ کسی ایک صورت کے ساتھ خاص نہیں بلکہ عام ہے اور ہر قسم کی ظاہری بے حیائی کو شامل ہے (جیسے فلمیں، ڈرامے، ٹی وی، وی سی آر، فحش اخبارات و رسائل، رقص و سرود اور مجروں کی محفلیں، عورتوں کی بے پردگی اور مردوں سے ان کا بے باکانہ اختلاط، مہندی اور شادی کی رسموں میں بے حیائی کے کھلے عام مظاہر وغیرہ) یہ سب فواحش ظاہرہ ہیں۔ (أَعَاذَنَا اللَّهُ مِنْهَا).

(۳) گناہ، اللہ کی نافرمانی کا نام ہے اور ایک حدیث میں نبی ﷺ نے فرمایا ”گناہ وہ ہے جو تیرے سینے میں کھٹکے اور لوگوں

وَأَنْ تَقُولُوا عَلَى اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ ﴿۳۳﴾

اس بات کو کہ تم اللہ کے ساتھ کسی ایسی چیز کو شریک ٹھہراؤ جس کی اللہ نے کوئی سند نازل نہیں کی اور اس بات کو کہ تم لوگ اللہ کے ذمے ایسی بات لگا دو جس کو تم جانتے نہیں۔ (۳۳)

وَلِكُلِّ أُمَّةٍ أَجَلٌ فَإِذَا جَاءَ أَجْلُهُمْ لَا يَسْتَأْذِنُونَ سَاعَةً
وَلَا يَسْتَعْتَبُونَ ﴿۳۴﴾

اور ہر گروہ کے لئے ایک میعاد معین^(۱) ہے سو جس وقت انکی میعاد معین آجائے گی اس وقت ایک ساعت نہ پیچھے ہٹ سکیں گے اور نہ آگے بڑھ سکیں گے۔ (۳۴)

يَبْنِي أَدَمَ إِنَّمَا يَا تَبِينَكُمْ رَسُولٌ مِنْكُمْ يَفْضُونَ عَلَيْكُمْ إِيَّتِي قَمِينَ
أَنْفِي وَأَصْلَمَ فَلَا حُوفَ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ﴿۳۵﴾

اے اولاد آدم! اگر تمہارے پاس پیغمبر آئیں جو تم ہی میں سے ہوں جو میرے احکام تم سے بیان کریں تو جو شخص تقویٰ اختیار کرے اور درستی کرے سو ان لوگوں پر نہ کچھ اندیشہ ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ (۳۵)^(۲)
اور جو لوگ ہمارے ان احکام کو جھٹلائیں اور ان سے تکبر کریں وہ لوگ دوزخ والے ہوں گے وہ اس میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔ (۳۶)^(۳)

وَالَّذِينَ كَفَرُوا يَا بَنِي آدَمَ لَا تَكْبُرُوا عَلَيْهَا وَأُولَئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ
هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ﴿۳۶﴾

کے اس پر مطلع ہونے کو تو برا سمجھے“ (صحیح مسلم، کتاب البر) بعض کہتے ہیں گناہ وہ ہے جس کا اثر، کرینوالے کی اپنی ذات تک محدود ہو اور بغی یہ ہے کہ اس کے اثرات دوسروں تک بھی پہنچیں یہاں بغی کے ساتھ بغیر الحق کا مطلب، ناحق، ظلم و زیادتی مثلاً لوگوں کا حق غصب کر لینا، کسی کا مال ہتھیالینا، ناجائز مارنا پیٹنا اور سب و شتم کر کے بے عزتی کرنا وغیرہ ہے۔

(۱) میعاد معین سے مراد وہ مہلت عمل ہے جو اللہ تبارک و تعالیٰ ہر گروہ کو آزمانے کے لئے عطا فرماتا ہے کہ وہ اس مہلت سے فائدہ اٹھا کر اللہ کو راضی کرنے کی کوشش کرتا ہے یا اس کی بغاوت و سرکشی میں مزید اضافہ ہوتا ہے۔ یہ مہلت بعض دفعہ ان کی پوری زندگیوں تک ممتد ہوتی ہے۔ یعنی دنیوی زندگی میں وہ گرفت نہیں فرماتا بلکہ صرف آخرت میں ہی وہ سزا دے گا ان کی اجل مسی قیامت کا دن ہی ہے اور جن کو دنیا میں وہ عذاب سے دوچار کر دیتا ہے، ان کی اجل مسی وہ ہے جب ان کا مؤاخذہ فرماتا ہے۔

(۲) یہ ان اہل ایمان کا حسن انجام بیان کیا گیا ہے جو تقویٰ اور عمل صالح سے آراستہ ہوں گے۔ قرآن نے ایمان کے ساتھ، اکثر جگہ، عمل صالح کا ذکر ضرور کیا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ عند اللہ ایمان وہی معتبر ہے جس کے ساتھ عمل بھی ہو گا۔

(۳) اس میں اہل ایمان کے برعکس ان لوگوں کا برا انجام بیان کیا گیا ہے جو اللہ کے احکام کی تکذیب اور ان کے مقابلے

سو اس شخص سے زیادہ ظالم کون ہو گا جو اللہ تعالیٰ پر جھوٹ باندھے یا اس کی آیتوں کو جھوٹا بتائے، ان لوگوں کے نصیب کا جو کچھ کتاب سے ہے وہ ان کو مل جائے گا،^(۱) یہاں تک کہ جب ان کے پاس ہمارے بھیجے ہوئے فرشتے ان کی جان قبض کرنے آئیں گے تو کہیں گے کہ وہ کہاں گئے جن کی تم اللہ کو چھوڑ کر عبادت کرتے تھے، وہ کہیں گے کہ ہم سے سب غائب ہو گئے اور اپنے کافر ہونے کا اقرار کریں گے۔ (۳۷)

اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ جو فرقے تم سے پہلے گزر چکے ہیں جنات میں سے بھی اور آدمیوں میں سے بھی، ان کے ساتھ تم بھی دوزخ میں جاؤ۔ جس وقت بھی کوئی جماعت داخل ہوگی اپنی دوسری جماعت کو لعنت کرے گی^(۲) یہاں تک کہ جب اس میں سب جمع ہو

فَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرَىٰ عَلَى اللَّهِ كَذِبًا أَوْ كَذَّبَ بِآيَاتِهِ ۗ
أُولَٰئِكَ يَتْلَوْنَ نَصِيحَتَهُمْ مِنَ الْكِتَابِ حَتَّىٰ إِذَا جَاءَتْهُمْ
رُسُلُنَا يَتَوَفَّوْنَهُمْ قَالُوا آيِنَ مَا كُنْتُمْ تَدْعُونَ مِنْ
دُونِ اللَّهِ قَالُوا ضَلُّوا عَنَّا وَشَهِدُوا عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ أَنَّهُمْ
كَانُوا كَافِرِينَ ﴿۳۷﴾

قَالَ ادْخُلُوا فِي أُمَمٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ مِنَ الْجِنِّ وَالْإِنْسِ
فِي النَّارِ كُلَّمَا دَخَلَتْ أُمَّةٌ لَعْنَتْ أُخْتَهَا حَتَّىٰ إِذَا دَارَكُوا فِيهَا
جَمِيعًا قَالَتْ أُخْرُنَهُمْ لِوَلَدِهِمْ رَبَّنَا هَؤُلَاءِ أَضَلُّونَا فَأَيِّم
عَنَّا يَا ضَعُفَاءَ مِنَ الْآثَارِ قَالِ لِكُلِّ ضِعْفٌ

میں استکبار کرتے ہیں۔ اہل ایمان اور اہل کفر دونوں کا انجام بیان کرنے سے مقصود یہ ہے کہ لوگ اس کردار کو اپنائیں جس کا انجام اچھا ہے اور اس کردار سے بچیں جس کا انجام برا ہے۔

(۱) اس کے مختلف معانی بیان کئے گئے ہیں۔ ایک معنی عمل، رزق اور عمر کے کئے گئے ہیں۔ یعنی ان کے مقدر میں جو عمر اور رزق ہے اسے پورا کر لینے، اور جتنی عمر ہے، اس کو گزار لینے کے بعد بالآخر موت سے ہمکنار ہوں گے۔ اسی کے ہم معنی یہ آیت ہے ﴿لِنَّ الَّذِينَ يَفْتَرُونَ عَلَى اللَّهِ الْكُذِبَ لَا يُفْلِحُونَ﴾ * ﴿مَتَّعْنَاهُمْ فِي الدُّنْيَا ثَمَرَ الْبَيْنَاتِ مَرَجَعُهُمْ﴾ الآية (یونس - ۷۶) ”جو لوگ اللہ پر جھوٹ باندھتے ہیں، وہ کامیاب نہیں ہوں گے، دنیا کا چند روزہ فائدہ اٹھا کر، بالآخر ہمارے پاس ہی انہیں لوٹ کر آنا ہے....“

(۲) اُمَمٌ، اُمَّةٌ کی جمع ہے۔ مراد وہ فرقے اور گروہ ہیں جو کفر و شقاق اور شرک و تکذیب میں ایک جیسے ہوں گے۔ فِئِي بِمَعْنَى مَعًا بھی ہو سکتا ہے۔ یعنی تم سے پہلے انسانوں اور جنوں میں جو گروہ تم جیسے یہاں آچکے ہیں، ان کے ساتھ جہنم میں داخل ہو جاؤ یا ان میں شامل ہو جاؤ۔

(۳) ﴿لَعْنَتْ أُخْتَهَا﴾ اپنی دوسری جماعت کو لعنت کرے گی۔ اُخْتٌ بہن کو کہتے ہیں۔ ایک جماعت (امت) کو دوسری جماعت (امت) کی بہن بہ اعتبار دین، یا گمراہی کے کہا گیا۔ یعنی دونوں ہی ایک غلط مذہب کے پیرو یا گمراہ تھے یا جہنم کے ساتھی ہونے کے اعتبار سے ان کو ایک دوسری کی بہن قرار دیا گیا ہے۔

وَلَكِنْ لَا تَعْلَمُونَ ﴿۳۸﴾

جائیں گے^(۱) تو پچھلے لوگ پہلے لوگوں کی نسبت کہیں گے^(۲) کہ ہمارے پروردگار ہم کو ان لوگوں نے گمراہ کیا تھا سو ان کو دوزخ کا عذاب دو گنا دے۔^(۳) اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ سب ہی کا دو گنا ہے،^(۴) لیکن تم کو خبر نہیں۔ (۳۸)

اور پہلے لوگ پچھلے لوگوں سے کہیں گے کہ پھر تم کو ہم پر کوئی فوقیت نہیں سو تم بھی اپنی کمائی کے بدلے میں عذاب کا مزہ چکھو۔ (۳۹)

جن لوگوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا اور ان سے تکبر کیا ان کے لئے آسمان کے دروازے نہ کھولے جائیں گے^(۵) اور وہ لوگ کبھی جنت میں نہ جائیں گے جب

وَقَالَتْ أُولَٰئِهِمْ لِكُرْهُهُمْ مِمَّا كَانَتْ لَكُمْ عَلَيْنَا مِنْ فَضِيلٍ
فَذُوقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْسِبُونَ ﴿۳۹﴾

إِنَّ الذِّبْنَ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا وَأَسْتَكْبَرُوا عَنْهَا لَا تَتَذَكَّرُ لَهُمْ
أَبْوَابُ السَّمَاءِ وَلَا يَدْخُلُونَ الْجَنَّةَ حَتَّىٰ يَلِجَ الْجَمَلُ فِي

(۱) اَدَارْ كُوْنَا کے معنی ہیں تَدَارَكُوا جب ایک دوسرے کو ملیں گے اور باہم اکٹھے ہوں گے۔

(۲) اٰخِرَىٰ (پچھلے) سے مراد بعد میں داخل ہونے والے اور اٰوَلَىٰ (پہلے) سے مراد ان سے پہلے داخل ہونے والے ہیں۔ یا اٰخِرَىٰ سے اٰتْبَاعٌ (پیروکار) اور اٰوَلَىٰ سے مَتَّبِعٌ (یڈر اور سردار ہیں۔ ان کا جرم چونکہ زیادہ شدید ہے کہ خود بھی راہ حق سے دور رہے اور دوسروں کو بھی کوشش کر کے اس سے دور رکھا، اس لئے یہ اپنے اتباع سے پہلے جہنم میں جائیں گے۔

(۳) جس طرح ایک دوسرے مقام پر فرمایا گیا۔ جنسی کہیں گے۔ ﴿ رَبَّنَا اِنَّا اٰطَعْنَا سَادَتَنَا وَكُبَّرْنَا فَاَصْلَحْنَا وَالتَّيْبِلَا * رَبَّنَا ﴿١٦٤﴾ (الأحزاب - ۶۷-۶۸) ”اے ہمارے رب! ہم تو اپنے سرداروں اور بڑوں کے پیچھے لگے رہے، پس انہوں نے ہمیں سیدھے راستے سے گمراہ کیا، یا اللہ ان کو دو گنا عذاب دے اور ان کو بڑی لعنت کر“

(۴) یعنی اب ایک دوسرے کو طعنے دینے، کوسنے اور ایک دوسرے پر الزام دھرنے سے کوئی فائدہ نہیں، تم سب ہی اپنی اپنی جگہ بڑے مجرم ہو اور تم سب ہی دو گنے عذاب کے مستحق ہو۔ اتباع اور متبوعین کا یہ مکالمہ سورہ سبأ- ۳۱-۳۲ میں بھی بیان کیا گیا ہے۔

(۵) اس سے بعض نے اعمال، بعض نے ارواح اور بعض نے دعا مراد لی ہے۔ یعنی ان کے عملوں، یا روحوں یا دعا کے لئے آسمان کے دروازے نہیں کھولے جاتے، یعنی اعمال اور دعا قبول نہیں ہوتی اور روہیں واپس زمیں میں لوٹا دی جاتی ہیں (جیسا کہ مسند احمد، جلد ۲ / صفحہ ۳۶۳-۳۶۵ کی ایک حدیث سے بھی معلوم ہوتا ہے) امام شوکانی فرماتے ہیں کہ تینوں ہی چیزیں مراد ہو سکتی ہیں۔

سَمِيعًا نَجِيًّا ۖ وَكَذَلِكَ نَجْزِي الْمُجْرِمِينَ ﴿۳۰﴾

لَهُمْ مِنْ جَهَنَّمَ مِهَادٌ وَمِنْ خَوَافِهِمْ غَوَاشٍ ۖ وَكَذَلِكَ نَجْزِي
الظَّالِمِينَ ﴿۳۱﴾

وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا
أُولَئِكَ أَصْحَابُ الْجَنَّةِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ﴿۳۲﴾

وَنَزَعْنَا مَا فِي صُدُورِهِمْ مِنْ غِلٍّ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهِمُ الْأَنْهَارُ

تک کہ اونٹ سوئی کے ناکہ کے اندر سے نہ چلا جائے^(۱)
اور ہم مجرم لوگوں کو ایسی ہی سزا دیتے ہیں۔ (۳۰)
ان کے لئے آتش دوزخ کا بچھونا ہو گا اور ان کے اوپر
(اسی کا) اوڑھنا ہو گا^(۲) اور ہم ایسے ظالموں کو ایسی ہی سزا
دیتے ہیں۔ (۳۱)

اور جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک کام کئے ہم
کسی شخص کو اس کی قدرت سے زیادہ کسی کا مکلف نہیں
بناتے^(۳) وہی لوگ جنت والے ہیں اور وہ اس میں ہمیشہ
ہمیشہ رہیں گے۔ (۳۲)

اور جو کچھ ان کے دلوں میں (کینہ) تھا ہم اس کو دور کر
دیں گے۔^(۴) ان کے نیچے نہریں جاری ہوں گی۔ اور وہ

(۱) یہ تعلق بالحال ہے جس طرح اونٹ کا سوئی کے ناکہ سے گذرنا ممکن نہیں، اسی طرح اہل کفر کا جنت میں داخلہ
ممکن نہیں۔ اونٹ کی مثال بیان فرمائی اس لئے کہ اونٹ عربوں میں متعارف تھا اور جسمانی اعتبار سے ایک بڑا جانور تھا۔
اور سوئی کا ناکہ (سوراخ) یہ اپنے باریک اور تنگ ہونے کے اعتبار سے بے مثال ہے۔ ان دونوں کے ذکر نے اس تعلق
بالحال کے مفہوم کو غایت درجے واضح کر دیا ہے۔ تعلق بالحال کا مطلب ہے، ایسی چیز کے ساتھ مشروط کر دینا جو ناممکن
ہو۔ جیسے اونٹ سوئی کے ناکہ میں داخل نہیں ہو سکتا۔ اب کسی چیز کے وقوع کو، اونٹ کے سوئی کے ناکہ میں داخل
ہونے کے ساتھ مشروط کر دینا، تعلق بالحال ہے۔

(۲) غَوَاشٍ، غَاشِيَةٌ کی جمع ہے۔ ڈھانپ لینے والی۔ یعنی آگ ہی ان کا اوڑھنا ہو گا یعنی اوپر سے بھی آگ نے ان کو
ڈھانپا یعنی گھیرا ہو گا۔

(۳) یہ جملہ معترضہ ہے جس سے مقصود یہ بتانا ہے کہ ایمان اور عمل صالح، یہ ایسی چیزیں نہیں ہیں کہ جو انسانی طاقت
سے زیادہ ہوں اور انسان ان پر عمل کرنے کی قدرت نہ رکھتے ہوں۔ بلکہ ہر انسان ان کو بہ آسانی اپنا سکتا ہے اور ان
کے مقتضیات کو بروئے عمل لاسکتا ہے۔

(۴) غِلٌّ اس کینے اور بغض کو کہا جاتا ہے جو سینوں میں مستور ہو۔ اللہ تعالیٰ اہل جنت پر یہ انعام بھی فرمائے گا کہ ان
کے سینوں میں ایک دوسرے کے خلاف بغض و عداوت کے جو جذبات ہوں گے، وہ دور کر دے گا، پھر ان کے دل ایک
دوسرے کے بارے میں آئینے کی طرح صاف ہو جائیں گے، کسی کے بارے میں دل میں کوئی کدورت اور عداوت نہیں
رہے گی۔ بعض نے اس کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ اہل جنت کے درمیان درجات و منازل کا جو تفاوت ہو گا، اس پر وہ
ایک دوسرے سے حسد نہیں کریں گے۔ پہلے مفہوم کی تائید ایک حدیث سے ہوتی ہے کہ جنتیوں کو، جنت اور دوزخ

لوگ کہیں گے کہ اللہ کا (لاکھ لاکھ) شکر ہے جس نے ہم کو اس مقام تک پہنچایا اور ہماری کبھی رسائی نہ ہوتی اگر اللہ تعالیٰ ہم کو نہ پہنچاتا۔^(۱) واقعی ہمارے رب کے پیغمبر سچی باتیں لے کر آئے تھے۔ اور ان سے پکار کر کہا جائے گا کہ اس جنت کے تم وارث بنائے گئے ہو اپنے اعمال کے بدلے۔^(۲) (۴۳)

اور اہل جنت اہل دوزخ کو پکاریں گے کہ ہم سے جو ہمارے رب نے وعدہ فرمایا تھا ہم نے تو اسکو واقعہ کے مطابق پایا، سو تم سے جو تمہارے رب نے وعدہ کیا تھا تم نے بھی اس کو واقعہ کے مطابق پایا؟^(۳) وہ کہیں گے ہاں،

وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي هَدَنَا لِهَذَا وَمَا كُنَّا لِنَهْتَدِيَ لَوْلَا
أَنْ هَدَانَا اللَّهُ لَقَدْ جَاءَتْ رَسُولَ رَبِّنَا بِالْحَقِّ وَنُودُوا أَنْ
يَتَّخِذُوا الْجَنَّةَ أُورِثُوا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ ﴿۴۳﴾

وَنَادَى أَصْحَابُ الْجَنَّةِ أَصْحَابَ النَّارِ أَنْ قَدْ وَجَدْنَا مَا وَعَدَنَا
رَبُّنَا حَقًّا فَهَلْ وَجَدْتُمْ مَا وَعَدَ رَبُّكُمْ حَقًّا قَالُوا نَعَمْ فَإِذَنْ
مُؤَذَّنٌ مُبِينٌ أَنْ لَعْنَةُ اللَّهِ عَلَى الظَّالِمِينَ ﴿۴۴﴾

کے درمیان ایک پل پر روک لیا جائے گا اور ان کے درمیان آپس کی جو زیادتیاں ہوں گی، ایک دوسرے کو ان کا بدلہ دیا دلایا جائے گا، حتیٰ کہ جب وہ بالکل پاک صاف ہو جائیں گے تو پھر انہیں جنت میں داخلے کی اجازت دے دی جائے گی (صحیح بخاری۔ کتاب المظالم، باب قصاص المظالم۔) جیسے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی باہمی رنجشیں ہیں جو سیاسی رقابت میں ان کے درمیان ہوئیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا قول ہے ”مجھے امید ہے کہ میں، عثمان رضی اللہ عنہ اور طلحہ رضی اللہ عنہ، وزیر رضی اللہ عنہ، ان لوگوں میں سے ہوں گے جن کے بارے میں اللہ نے فرمایا ہے ﴿وَتَرْغَبُنَا بِقَبُولِهِمْ مَنِ غَيْرِ﴾ (ابن کثیر)

(۱) یعنی یہ ہدایت جس سے ہمیں ایمان اور عمل صالح کی زندگی نصیب ہوئی اور پھر انہیں بارگاہ الہی میں قبولیت کا درجہ بھی حاصل ہوا۔ یہ اللہ تعالیٰ کی خاص رحمت ہے اور اس کا فضل ہے۔ اگر یہ رحمت اور فضل الہی نہ ہوتا تو ہم یہاں تک نہ پہنچ سکتے۔ اسی مفہوم کی یہ حدیث ہے جس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”یہ بات اچھی طرح جان لو کہ تم میں سے کسی کو محض اس کا عمل جنت میں نہیں لے جائے گا، جب تک کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت نہ ہوگی۔“ صحابہ رضی اللہ عنہم نے پوچھا یا رسول اللہ! آپ صلی اللہ علیہ وسلم بھی؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہاں میں بھی، اس وقت تک جنت میں نہیں جاؤں گا جب تک کہ رحمت الہی مجھے اپنے دامن میں نہیں سمیٹ لے گی۔“ صحیح بخاری، کتاب الرقاق، باب القصد والمداومة علی العمل۔ صحیح مسلم، کتاب صفة القيامة۔ باب لن يدخل أحد الجنة بعمله۔

(۲) یہ تصریح پچھلی بات اور حدیث مذکور کے منافی نہیں۔ اس لئے کہ نیک عمل کی توفیق بھی بجائے خود اللہ کا فضل واحسان ہے۔

(۳) یہی بات نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگ بدر میں جو کافر مارے گئے تھے اور ان کی لاشیں ایک کنوئیں میں پھینک دی گئی تھیں۔ انہیں خطاب کرتے ہوئے کسی تھی، جس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا تھا ”آپ ایسے لوگوں سے خطاب فرما رہے ہیں

پھر ایک پکارنے والا دونوں کے درمیان میں پکارے گا کہ
اللہ کی مار ہو ان ظالموں پر۔ (۴۳)

جو اللہ کی راہ سے اعراض کرتے تھے اور اس میں کجی
تلاش کرتے تھے اور وہ لوگ آخرت کے بھی منکر
تھے۔ (۴۵)

اور ان دونوں کے درمیان ایک آڑ ہوگی^(۱) اور اعراف کے
اوپر بہت سے آدمی ہوں گے وہ لوگ،^(۲) ہر ایک کو ان کے
قیافہ سے پہچانیں گے^(۳) اور اہل جنت کو پکار کر کہیں گے،
السلام علیکم! ابھی یہ اہل اعراف جنت میں داخل نہیں
ہوئے ہوں گے اور اس کے امیدوار ہوں گے۔^(۴) (۴۶)
اور جب ان کی نگاہیں اہل دوزخ کی طرف پھریں گی تو
کہیں گے اے ہمارے رب! ہم کو ان ظالم لوگوں کے
ساتھ شامل نہ کر۔ (۴۷)

الَّذِينَ يَصُدُّونَ عَنِ سَبِيلِ اللَّهِ وَيَبْغُونَهَا عِوَجًا وَهُمْ
بِالْآخِرَةِ كَافِرُونَ ﴿۴۵﴾

وَيَبَيِّنُهُمَا حِجَابٌ وَعَلَى الْأَعْرَافِ رِجَالٌ يَعْرِفُونَ كُلًّا بِسِيمَتِهِمْ
وَنَادُوا أَصْحَابَ الْجَنَّةِ أَنْ سَلِّمُوا عَلَيْهِمْ لَمْ يَدْخُلُوهَا
وَهُمْ يَطْمَعُونَ ﴿۴۶﴾

وَأَذْهَبَتْ أَبْصَارُهُمْ تِلْقَاءَ أَصْحَابِ النَّارِ قَالُوا رَبَّنَا لَا
تَجْعَلْنَا مَعَ الْقَوْمِ الظَّالِمِينَ ﴿۴۷﴾

جو ہلاک ہو چکے ہیں“ آپ ﷺ نے فرمایا ”اللہ کی قسم“ میں انہیں جو کچھ کہہ رہا ہوں، وہ تم سے زیادہ سن رہے ہیں،
لیکن اب وہ جواب دینے کی طاقت نہیں رکھتے“ (صحیح مسلم - کتاب الجنة، باب عرض مقعد المبت من
الجنة أو النار والبخاری، کتاب المغازی، باب قتل اُبی جہل)

(۱) ”ان دونوں کے درمیان“ سے مراد جنت دوزخ کے درمیان یا کافروں اور مومنوں کے درمیان ہے۔ حِجَابٌ
(آڑ) سے وہ فصیل (دیوار) مراد ہے جس کا ذکر سورہ حدید میں ہے۔ ﴿فَضْرِبَ بَيْنَهُمُ بِسُورَةٍ بَابٌ﴾ (الحديد-۱۳) ”پس
ان کے درمیان ایک دیوار کھڑی کر دی جائے گی، جس میں ایک دروازہ ہوگا“ یہی اعراف کی دیوار ہے۔

(۲) یہ کون ہوں گے؟ ان کی تعیین میں مفسرین کے درمیان خاصا اختلاف ہے۔ اکثر مفسرین کے نزدیک یہ وہ لوگ ہوں
گے جن کی نیکیاں اور برائیاں برابر ہوں گی۔ ان کی نیکیاں جہنم میں جانے سے اور برائیاں جنت میں جانے سے مانع ہوں
گی اور یوں اللہ تعالیٰ کی طرف سے قطعی فیصلہ ہونے تک وہ درمیان میں معلق رہیں گے۔

(۳) سِيمَاءُ کے معنی علامت کے ہیں۔ جنتیوں کے چہرے روشن اور تروتازہ اور جہنمیوں کے چہرے سیاہ اور آنکھیں
نیلی ہوں گی۔ اس طرح وہ دونوں قسم کے لوگوں کو پہچان لیں گے۔

(۴) یہاں يَطْمَعُونَ کے معنی بعض لوگوں نے يَعْلَمُونَ کے کئے ہیں یعنی ان کو علم ہوگا کہ وہ عنقریب جنت میں
داخل کر دیئے جائیں گے۔

اور اہل اعراف بہت سے آدمیوں کو جن کو کہ ان کے قیافہ سے پہچانیں گے پکاریں گے کہیں گے کہ تمہاری جماعت اور تمہارا اپنے کو بڑا سمجھنا تمہارے کچھ کام نہ آیا۔^(۱) (۳۸)

کیا یہ وہی ہیں جن کی نسبت تم قسمیں کھا کھا کر کہا کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ ان پر^(۲) رحمت نہ کرے گا، ان کو یوں حکم ہو گا کہ جاؤ جنت میں تم پر نہ کچھ خوف ہے اور نہ تم مغموم ہو گے۔ (۳۹)

اور دوزخ والے جنت والوں کو پکاریں گے کہ ہمارے اوپر تھوڑا پانی ہی ڈال دو یا اور ہی کچھ دے دو، جو اللہ نے تم کو دے رکھا ہے۔ جنت والے کہیں گے کہ اللہ تعالیٰ نے دونوں چیزوں کی کافروں کے لئے بندش کر دی ہے۔^(۳) (۵۰)

جنہوں نے دنیا میں اپنے دین کو لہو و لعب بنا رکھا تھا اور جن کو دنیاوی زندگی نے دھوکہ میں ڈال رکھا تھا۔ سو ہم (بھی) آج کے روز ان کا نام بھول جائیں گے جیسا کہ وہ

وَنَادَى أَصْحَابُ الْأَعْرَافِ رَجُلًا يَعْرِفُهُمْ بَيْنَهُمْ قَالُوا مَا آغَيْنِي عَنْكُمْ جَمْعَكُمْ وَمَا كُنْتُمْ تُسْتَكْبِرُونَ ﴿۳۸﴾

أَهْوَاءَ الَّذِينَ أَقْسَمْتُمْ لَا يَبَالَهُمُ اللَّهُ بِرَحْمَةٍ أَدْخَلُوا الْجَنَّةَ لَأَخَوفُ عَلَيْكُمْ وَلَا أَنْتُمْ تُعْزَبُونَ ﴿۳۹﴾

وَنَادَى أَصْحَابُ النَّارِ أَصْحَابَ الْجَنَّةِ أَنْ أَفِيضُوا عَلَيْنَا مِنَ الْمَاءِ أَوْ مِمَّا رَزَقَكُمُ اللَّهُ قَالُوا إِنَّ اللَّهَ حَرَمَهُمَا عَلَى الْكَافِرِينَ ﴿۵۰﴾

الَّذِينَ اتَّخَذُوا دِينَهُمْ لَهْوًا وَلَعِبًا وَغَرَّتْهُمُ الْحَيَاةُ الدُّنْيَا قَالِئَوْمَ نَسْتَمُكِنُ كَمَا نَسُوا الْآيَاتِ يَوْمَ هَذَا وَمَا كَانُوا يَلْبِسُونَ ﴿۳۸﴾

(۱) یہ اہل دوزخ ہوں گے جن کو اصحاب الاعراف ان کی علامتوں سے پہچان لیں گے اور وہ اپنے جتھے اور دوسری چیزوں پر جو گھمنڈ کرتے تھے اس کے حوالے سے انہیں یاد دلائیں گے کہ یہ چیزیں تمہارے کچھ کام نہ آئیں۔

(۲) اس سے مراد وہ اہل ایمان ہیں جو دنیا میں غریب و مسکین اور مفلس و نادار قسم کے تھے جن کا استہزاء کورہ متکبرین اڑایا کرتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ اگر یہ اللہ کے محبوب ہوتے تو ان کا دنیا میں یہ حال ہوتا؟ پھر مزید جسارت کرتے ہوئے دعویٰ کرتے کہ قیامت والے دن بھی اللہ کی رحمت ہم پر ہوگی (جس طرح دنیا میں ہو رہی ہے) نہ کہ ان پر۔ بعض نے اس کا قائل اصحاب الاعراف کو بتلایا ہے اور بعض کہتے ہیں جب اصحاب الاعراف جنہیوں کو یہ کہیں گے ”تمہارا جتھہ اور تمہارا اپنے کو بڑا سمجھنا تمہارے کچھ کام نہ آیا“ تو اس وقت اللہ کی طرف سے جنتیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا جائے گا کہ ”یہ وہی لوگ ہیں جن کے بارے میں تم قسمیں کھاتے تھے کہ ان پر اللہ کی رحمت نہیں ہو گی۔“ (تفسیر ابن کثیر)

(۳) جس طرح پہلے گزر چکا ہے کہ کھانے پینے کی نعمتیں قیامت والے دن صرف اہل ایمان کے لئے ہوں گی۔ ﴿خَالِصَةً يَوْمَ الْقِيَامَةِ﴾ (آیت نمبر ۳۲) یہاں اس کی مزید وضاحت جنتیوں کی زبان سے کر دی گئی ہے۔

اس دن کو بھول^(۱) گئے اور جیسا یہ ہماری آیتوں کا انکار کرتے تھے۔ (۵۱)

اور ہم نے ان لوگوں کے پاس ایک ایسی کتاب پہنچادی ہے جس کو ہم نے اپنے علم کامل سے بہت واضح کر کے بیان کر دیا ہے،^(۲) وہ ذریعہ ہدایت اور رحمت ان لوگوں کے لئے ہے جو ایمان لائے ہیں۔ (۵۲)

ان لوگوں کو اور کسی بات کا انتظار نہیں صرف اس کے اخیر نتیجہ کا انتظار ہے،^(۳) جس روز اسکا اخیر نتیجہ پیش آئے گا اور اس روز جو لوگ اس کو پہلے سے بھولے

وَلَقَدْ جِئْنَاهُمْ بِكِتَابٍ فَصَّلْنَاهُ عَلَىٰ عَلَيْهِمْ هُدًى وَرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ ﴿۵۱﴾

هَلْ يَنْظُرُونَ إِلَّا تَأْوِيلَهُ يَوْمَ يَأْتِي تَأْوِيلَهُ يَقُولُ الَّذِينَ نَسُوهُ مِنْ قَبْلُ قَدْ جَاءَتْ رُسُلُ رَبِّنَا بِالْحَقِّ

(۱) حدیث میں آتا ہے، قیامت والے دن اللہ تعالیٰ اس قسم کے بندے سے کہے گا ”کیا میں نے تجھے بیوی بچے نہیں دیئے تھے؟ تجھے عزت و اکرام سے نہیں نوازا تھا؟ کیا اونٹ اور گھوڑے تیرے تابع نہیں کر دیئے تھے؟ اور کیا تو سرداری کرتے ہوئے لوگوں سے چنگی وصول نہیں کرتا تھا؟ وہ کہے گا کیوں نہیں؟ یا اللہ یہ سب باتیں صحیح ہیں۔ اللہ تعالیٰ اس سے پوچھے گا، کیا تو میری ملاقات کا یقین رکھتا تھا؟ وہ کہے گا۔ نہیں، اللہ تعالیٰ فرمائے گا، ”بس جس طرح تو مجھے بھولا رہا، آج میں تجھے بھول جاتا ہوں“ (صحیح مسلم۔ کتاب الزہد) قرآن کریم کی اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ دین کو لہو و لعب بنانے والے وہی ہوتے ہیں جو دنیا کے فریب میں مبتلا ہوتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے دلوں سے چونکہ آخرت کی فکر اور اللہ کا خوف نکل جاتا ہے۔ اس لئے وہ دین میں بھی اپنی طرف سے جو چاہتے ہیں، اضافہ کر لیتے ہیں اور دین کے جس حصے کو چاہتے ہیں عملاً کالعدم کر دیتے ہیں یا انہیں کھیل کود کا رنگ دے دیتے ہیں۔ اس لیے دین میں اپنی طرف سے بدعات کا اضافہ کر کے انہی کو اصل اہمیت دینا (جیسا کہ اہل بدعت کا شیوہ ہے) یہ بہت بڑا جرم ہے، کیونکہ اس سے دین کھیل کود بن کر رہ جاتا ہے اور احکام و فرائض پر عمل کی اہمیت ختم ہو جاتی ہے۔

(۲) یہ اللہ تعالیٰ جنہیوں کے ضمن میں ہی فرما رہا ہے کہ ہم نے تو اپنے علم کامل کے مطابق ایسی کتاب بھیج دی تھی جس میں ہر چیز کو کھول کر بیان کر دیا تھا۔ ان لوگوں نے اس سے فائدہ نہیں اٹھایا، تو ان کی بد قسمتی، ورنہ جو لوگ اس کتاب پر ایمان لے آئے، وہ ہدایت و رحمت الہی سے فیض یاب ہوئے گویا ہم نے تو ﴿ وَمَا لَكُمْ لِمُعَذِّبِينَ حَتَّىٰ نَبْعَثَ رَسُولًا ﴾ (سورۃ بنی اسرائیل-۱۵) ”جب تک ہم رسول بھیج کر اتمام حجت نہیں کر دیتے، ہم عذاب نہیں دیتے“ کے مطابق اہتمام کر دیا تھا۔

(۳) تاویل کا مطلب ہے، کسی چیز کی اصل حقیقت اور انجام۔ یعنی کتاب الہی کے ذریعے سے وعدے، وعید اور جنت و دوزخ وغیرہ کا بیان تو کر دیا گیا تھا۔ لیکن یہ اس دنیا کا انجام اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے منتظر تھے، سو اب وہ انجام ان کے سامنے آگیا۔

قَهَلْنَا مِنْ شُفَعَاءَ فَيَشْفَعُونَ لَنَا أَوْ نُؤَدُّ فَنَعْمَلْ غَيْرَ الَّذِي
كُنَّا نَعْمَلُ قَدْ خَيْرُوا أَنفُسَهُمْ وَصَلَّ عَنْهُمْ مَا كَانُوا
يَفْعَلُونَ ﴿۵۳﴾

ہوئے تھے یوں کہیں گے کہ واقعی ہمارے رب کے پیغمبر
چچی چچی باتیں لائے تھے، سواب کیا کوئی ہمارا سفارشی ہے
کہ وہ ہماری سفارش کر دے یا کیا ہم پھر واپس بھیجے جا
سکتے ہیں تاکہ ہم لوگ ان اعمال کے، جن کو ہم کیا کرتے
تھے برخلاف دوسرے اعمال کریں۔ بے شک ان لوگوں
نے اپنے آپ کو خسارہ میں ڈال دیا اور یہ جو جو باتیں
تراشتے تھے سب گم ہو گئیں۔^(۱) (۵۳)

بے شک تمہارا رب اللہ ہی ہے جس نے سب آسمانوں
اور زمین کو چھ روز میں پیدا کیا ہے،^(۲) پھر عرش پر قائم
ہوا۔^(۳) وہ شب سے دن کو ایسے طور پر چھپا دیتا ہے کہ

إِنَّ رَبَّكُمُ اللَّهُ الَّذِي خَلَقَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ فِي سِتَّةِ
أَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوَىٰ عَلَى الْعَرْشِ يُغْشِي اللَّيْلَ النَّهَارَ يَطْلُبُهُ

(۱) یعنی یہ جس انجام کے منتظر تھے، اس کے سامنے آجانے کے بعد اعتراف حق کرنے یا دوبارہ دنیا میں بھیجے جانے کی
آرزو اور کسی سفارشی کی تلاش، یہ سب بے فائدہ ہوں گی۔ وہ معبود بھی ان سے گم ہو جائیں گے جن کی وہ اللہ کو چھوڑ
کر عبادت کرتے تھے، وہ ان کی مدد کر سکیں گے نہ سفارش اور نہ عذاب جنہم سے چھڑا ہی سکیں گے۔

(۲) یہ چھ دن اتوار، پیر، منگل، بدھ، جمعرات اور جمعہ ہیں۔ جمعہ کے دن ہی حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق ہوئی۔ ہفتے
والے دن کہتے ہیں کوئی تخلیق نہیں ہوئی، اسی لئے اسے یوم السبت کہا جاتا ہے۔ کیونکہ سبت کے معنی قطع (کانٹے) کے
ہیں یعنی اس دن تخلیق کا کام قطع ہو گیا۔ پھر اس دن سے کیا مراد ہے؟ ہماری دنیا کا دن، جو طلوع شمس سے شروع ہوتا
ہے اور غروب شمس پر ختم ہو جاتا ہے۔ یا یہ دن ہزار سال کے برابر ہے؟ جس طرح کہ اللہ کے یہاں کے دن کی گنتی
ہے، یا جس طرح قیامت کے دن کے بارے میں آتا ہے۔ بظاہر یہ دوسری بات زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ ایک تو
اس وقت سورج چاند کا یہ نظام ہی نہیں تھا، آسمان و زمین کی تخلیق کے بعد ہی یہ نظام قائم ہوا دوسرے یہ عالم بالا کا واقعہ
ہے جس کو دنیا سے کوئی نسبت نہیں ہے، اس لئے اس دن کی اصل حقیقت اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے۔ ہم قطعیت کے
ساتھ کوئی بات نہیں کہہ سکتے۔ علاوہ ازیں اللہ تعالیٰ تو لفظ کُن سے سب کچھ پیدا کر سکتا تھا، اس کے باوجود اس نے ہر چیز
کو الگ الگ تدریج کے ساتھ بنایا اس کی بھی اصل حکمت اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے تاہم بعض علمائے اس کی ایک حکمت
لوگوں کو آرام، وقار اور تدریج کے ساتھ کام کرنے کا سبق دینا بتلائی ہے۔ وَاللَّهُ أَعْلَمُ۔

(۳) آستواء کے معنی علو اور استقرار کے ہیں سلف نے بلا کیف و بلا تشبیہ یہی معنی مراد لئے ہیں۔ یعنی اللہ تعالیٰ عرش پر
بلند اور مستقر ہے۔ لیکن کس طرح، کس کیفیت کے ساتھ، اسے ہم بیان نہیں کر سکتے نہ کسی کے ساتھ تشبیہ ہی دے
سکتے ہیں۔ نعیم بن حماد کا قول ہے ”جو اللہ کی مخلوق کے ساتھ تشبیہ دے اس نے بھی کفر کیا اور جس نے اللہ کی اپنے
بارے میں بیان کر دہ کسی بات کا انکار کیا، اس نے بھی کفر کیا“ اور اللہ کے بارے میں اس کی یا اس کے رسول کی بیان

وہ شب اس دن کو جلدی سے آتی ہے^(۱) اور سورج اور چاند اور دوسرے ستاروں کو پیدا کیا ایسے طور پر کہ سب اس کے حکم کے تابع ہیں۔ یاد رکھو اللہ ہی کے لئے خاص ہے خالق ہونا اور حاکم ہونا، بڑی خوبیوں سے بھرا ہوا ہے اللہ جو تمام عالم کا پروردگار ہے۔ (۵۴)

تم لوگ اپنے پروردگار سے دعا کیا کرو گڑگڑا کر کے بھی اور چپکے چپکے بھی۔ واقعی اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو ناپسند کرتا ہے جو حد سے نکل جائیں۔ (۵۵)

اور دنیا میں اس کے بعد کہ اس کی درستی کر دی گئی ہے، فساد مت پھیلاؤ اور تم اللہ کی عبادت کرو اس سے ڈرتے ہوئے اور امیدوار رہتے ہوئے۔ بے شک اللہ تعالیٰ کی رحمت نیک کام کرنے والوں کے نزدیک ہے۔^(۲) (۵۶)

اور وہ ایسا ہے کہ اپنی باران رحمت سے پہلے ہواؤں کو بھیجتا ہے کہ وہ خوش کر دیتی ہیں،^(۳) یہاں تک کہ جب

حَيْثُنَا وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ وَالنُّجُومُ مَسْعُورَاتٌ يَا مُرَّةَ الْأَلَا لَهُ الْخَلْقِ وَالْأَمْرُ تَبَرَّكَ اللَّهُ رَبُّ الْعَالَمِينَ ﴿۵۴﴾

ادْعُوا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَخُفْيَةً إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِينَ ﴿۵۵﴾

وَلَا تُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ بَعْدَ إِصْلَاحِهَا وَادْعُوهُ خَوْفًا وَطَمَعًا إِنَّ رَحْمَتَ اللَّهِ قَرِيبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِينَ ﴿۵۶﴾

وَهُوَ الَّذِي يُرْسِلُ الرِّيحَ بُشْرًا لِّبَنِي يَدَايِ رَحْمَتِهِ

کردہ بات کو بیان کرنا، تشبیہ نہیں ہے۔ اس لئے جو باتیں اللہ تعالیٰ کے بارے میں نص سے ثابت ہیں، ان پر بلا تاویل اور بلا کیف و تشبیہ ایمان رکھنا ضروری ہے۔ (ابن کثیر)

(۱) حَيْثُنَا کے معنی ہیں نہایت تیزی سے اور مطلب ہے کہ ایک کے بعد دوسرا فوراً آجاتا ہے۔ یعنی دن کی روشنی آتی ہے تو رات کی تاریکی فوراً کافور ہو جاتی ہے اور رات آتی ہے تو دن کا اجالا ختم ہو جاتا ہے اور سب دور و نزدیک سیاہی چھا جاتی ہے۔

(۲) ان آیات میں چار چیزوں کی تلقین کی گئی ہے، ۱۔ اللہ تعالیٰ سے آہ و زاری اور خفیہ طریقے سے دعا کی جائے۔ جس طرح کہ حدیث میں بھی آتا ہے۔ ”لوگو! اپنے نفس کے ساتھ نرمی کرو (یعنی آواز پست رکھو) تم جس کو پکار رہے ہو، وہ بہرا ہے نہ غائب، وہ تمہاری دعائیں سننے والا اور قریب ہے (صحیح بخاری، کتاب الدعوات، باب الدعاء إذا علا عقبہ۔ ومسلم۔ کتاب الجنة، باب استحباب خفض الصوت بالذكر)

۲۔ دعا میں زیادتی نہ کی جائے یعنی اپنی حیثیت اور مرتبے سے بڑھ کر دعا نہ کی جائے۔ ۳۔ اصلاح کے بعد فساد نہ پھیلا یا جائے یعنی اللہ کی نافرمانیاں کر کے فساد پھیلانے میں حصہ نہ لیا جائے۔ ۴۔ اس کے عذاب کا ڈر بھی دل میں ہو اور اس کی رحمت کی امید بھی۔ اس طریقے سے دعا کرنے والے محسنین ہیں۔ یقیناً اللہ کی رحمت ان کے قریب ہے۔

(۳) اپنی الوہیت و ربوبیت کے اثبات میں اللہ تعالیٰ مزید دلائل بیان فرما کر پھر اس سے احیاء موتی کا اثبات فرما رہا ہے

وہ ہوائیں بھاری بادلوں کو اٹھالیتی ہیں،^(۱) تو ہم اس بادل کو کسی خشک سرزمین کی طرف ہانک لے جاتے ہیں، پھر اس بادل سے پانی برساتے ہیں پھر اس پانی سے ہر قسم کے پھل نکالتے ہیں۔^(۲) یوں ہی ہم مردوں کو نکال کھڑا کریں گے تاکہ تم سمجھو۔^(۳) (۵۷)

اور جو ستھری سرزمین ہوتی ہے اس کی پیداوار تو اللہ کے حکم سے خوب نکلتی ہے اور جو خراب ہے اس کی پیداوار بہت کم نکلتی ہے،^(۴) اسی طرح ہم دلائل کو طرح طرح سے بیان کرتے ہیں، ان لوگوں کے لئے جو شکر کرتے ہیں۔ (۵۸)

ہم نے نوح (علیہ السلام) کو ان کی قوم کی طرف بھیجا تو

حَتَّىٰ إِذَا أَقَلَّتْ سَحَابًا نِّعَالًا سُقِنَهُ لِبَيْتِكَ مَيْتَةٍ
فَأَنْزَلْنَا بِوَالِي الْمَاءِ فَأَخْرَجْنَا بِهِ مِنْ كُلِّ الثَّمَرَاتِ
كَذَلِكَ نُخْرِجُ الْمَوْتَى لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ ۝

وَالْبَلَدُ الطَّيِّبُ يَخْرِجُ نَبَاتُهُ بِإِذْنِ رَبِّهِ وَالَّذِي خَبُثَ
لَا يَخْرِجُ إِلَّا نَجَسًا ۚ كَذَلِكَ نُنْزِلُ الْغَيْثَ لِقَوْمٍ يَشْكُرُونَ ۝

لَقَدْ أَرْسَلْنَا نُوحًا إِلَىٰ قَوْمِهِ فَقَالَ لِقَوْمِهِ اعْبُدُوا اللَّهَ مَا

بَشَرًا ۚ بَشِيرٌ كِي جَمْعُ هَيْ رَحْمَةً سَمَاءُ مَطَرٌ (بارش) ہے یعنی بارش سے پہلے وہ ٹھنڈی ہوائیں چلاتا ہے جو بارش کی نوید ہوتی ہیں۔

(۱) بھاری بادل سے مراد پانی سے بھرے ہوئے بادل ہیں۔

(۲) ہر قسم کے پھل، جو رنگوں میں، ذائقوں میں، خوشبوؤں میں اور شکل و صورت میں ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں۔

(۳) جس طرح ہم پانی کے ذریعے سے مردہ زمین میں روئیدگی پیدا کر دیتے ہیں اور وہ انواع و اقسام کے غلے اور پھل پیدا کرتی ہے۔ اسی طرح قیامت والے دن تمام انسانوں کو، جو مٹی میں مل کر مٹی ہو چکے ہوں گے، ہم دوبارہ زندہ کریں گے اور پھر ان کا حساب لیں گے۔

(۴) علاوہ ازیں یہ تمثیل بھی ہو سکتی ہے۔ اَلْبَلَدُ الطَّيِّبُ سے مراد سربیع الفہم اور اَلْبَلَدُ الْخَبِيثُ سے کندزہن، وعظ و نصیحت قبول کرنے والا دل اور اس کے برعکس دل۔ قلب مومن یا قلب منافق یا پاکیزہ انسان اور ناپاک انسان۔ مومن، پاکیزہ انسان اور وعظ و نصیحت قبول کرنے والا دل بارش کو قبول کرنے والی زمین کی طرح، آیات الہی کو سن کر ایمان و عمل صالح میں مزید پختہ ہوتا ہے اور دوسرا دل اس کے برعکس زمین شور کی طرح ہے جو بارش کا پانی قبول ہی نہیں کرتی یا کرتی ہے تو برائے نام جس سے پیداوار بھی نکلی اور برائے نام ہوتی ہے۔ اسی کو ایک حدیث میں اس طرح بیان کیا گیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے بیان فرمایا کہ ”مجھے اللہ تعالیٰ نے جو علم و ہدایت دے کر بھیجا ہے، اس کی مثال اس موسلا دھار بارش کی طرح ہے جو زمین پر برسی۔ اس کے جو حصے زرخیز تھے، انہوں نے پانی کو اپنے اندر جذب کر کے چارہ اور گھاس خوب اگایا (یعنی بھرپور پیداوار دی) اور اس کے بعض حصے سخت تھے، جنہوں نے پانی کو تو روک لیا (اندر جذب

انہوں نے فرمایا اے میری قوم! تم اللہ کی عبادت کرو اس کے سوا کوئی تمہارا معبود ہونے کے قابل نہیں، مجھ کو تمہارے لئے ایک بڑے دن کے عذاب کا اندیشہ ہے۔ (۵۹)

ان کی قوم کے بڑے لوگوں نے کہا کہ ہم تم کو صریح غلطی میں دیکھتے ہیں۔^(۱) (۶۰)

انہوں نے فرمایا کہ اے میری قوم! مجھ میں تو ذرا بھی گمراہی نہیں لیکن میں پروردگار عالم کا رسول ہوں۔ (۶۱) تم کو اپنے پروردگار کے پیغام پہنچاتا ہوں اور تمہاری خیر خواہی کرتا ہوں اور میں اللہ کی طرف سے ان امور کی خبر رکھتا ہوں جن کی تم کو خبر نہیں۔ (۶۲)

اور کیا تم اس بات سے تعجب کرتے ہو کہ تمہارے پروردگار کی طرف سے تمہارے پاس ایک ایسے شخص کی معرفت، جو تمہاری ہی جنس کا ہے، کوئی نصیحت کی بات آگئی تاکہ وہ شخص تم کو ڈرائے اور تاکہ تم ڈر جاؤ^(۲) اور تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔ (۶۳)

لَكُمْ مِنَ الْوَعْدِ إِذْ أَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيمٍ ۝

قَالَ الْمَلَأُ مِنْ قَوْمِهِ إِنَّا لَنَرُكَ فِي ضَلِيلٍ مُّبِينٍ ۝

قَالَ يَقَوْمِ لَيْسَ بِي ضَلَالَةٌ وَلَكِنِّي رَسُولٌ مِنْ رَبِّ الْعَالَمِينَ ۝

أَبْلَغُكُمْ رَسُولًا لِنِيتِي وَأَنْصَحُ لَكُمْ وَأَعْلَمُ مِنَ اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ ۝

أَوْ يَحِبُّوا أَنْ جَاءَهُمْ ذِكْرٌ مِنْ رَبِّكُمْ عَلَى رَجُلٍ مِنْكُمْ لِيُنذِرَ لَكُمْ وَيَلْتَفِتُوا وَلَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ ۝

نہیں ہوا) تاہم اس سے بھی لوگوں نے فائدہ اٹھایا، خود بھی پیا۔ کھیتوں کو بھی سیراب کیا اور کاشت کاری کی اور زمین کا کچھ حصہ بالکل چھیل تھا، جس نے پانی روکا اور نہ کچھ اگایا۔ پس یہ اس شخص کی مثال ہے جس نے اللہ کی دین میں سمجھ حاصل کی اور اللہ نے مجھے جس چیز کے ساتھ بھیجا، اس سے اس نے نفع اٹھایا، پس خود بھی علم حاصل کیا اور دوسروں کو بھی سکھلایا اور مثال اس شخص کی بھی ہے جس نے کچھ نہیں سیکھا اور نہ وہ ہدایت ہی قبول کی جس کے ساتھ مجھے بھیجا گیا۔ - صحیح بخاری، کتاب العلم، باب فضل من علم وعلم،

(۱) شرک اس طرح انسانی عقل کو ماؤف کر دیتا ہے کہ انسان کو ہدایت، گمراہی اور گمراہی ہدایت نظر آتی ہے۔ چنانچہ قوم نوح کی بھی یہی قلبی ماہیت ہوئی، ان کو حضرت نوح علیہ السلام، جو اللہ کی توحید کی طرف اپنی قوم کو دعوت دے رہے تھے، نَعُوذُ بِاللَّهِ گمراہ نظر آتے تھے۔ -

تھا جو ناخوب، بتدریج وہی خوب ہوا کہ غلامی میں بدل جاتا ہے قوموں کا ضمیر

(۲) حضرت نوح علیہ السلام اور حضرت آدم علیہ السلام کے درمیان دس قرون یا دس پشتوں کا فاصلہ ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام سے کچھ پہلے تک تمام لوگ اسلام پر قائم چلے آ رہے تھے پھر سب سے پہلے توحید سے انحراف اس طرح آیا کہ اس قوم

سو وہ لوگ ان کی تکذیب ہی کرتے رہے تو ہم نے نوح (علیہ السلام) کو اور ان کو جو ان کے ساتھ کشتی میں تھے، بچا لیا اور جن لوگوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا تھا ان کو ہم نے غرق کر دیا۔ بے شک وہ لوگ اندھے ہو رہے تھے۔^(۱) (۶۴)

اور ہم نے قوم عاد کی طرف ان کے بھائی ہود (علیہ السلام) کو بھیجا۔^(۲) انہوں نے فرمایا اے میری قوم! تم اللہ کی عبادت کرو، اس کے سوا کوئی تمہارا معبود نہیں، سو کیا تم نہیں ڈرتے۔ (۶۵)

ان کی قوم میں جو بڑے لوگ کافر تھے انہوں نے کہا ہم تم کو کم عقلی میں دیکھتے ہیں۔^(۳) اور ہم بے شک تم کو جھوٹے لوگوں میں سمجھتے ہیں۔ (۶۶)

انہوں نے فرمایا کہ اے میری قوم! مجھ میں ذرا بھی کم

فَكَذَّبُوهُ فَأَجْمَعُنَا وَالَّذِينَ مَعَهُ فِي الْفُلْكِ وَأَغْرَقْنَا
الَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا إِنَّهُمْ كَانُوا قَوْمًا عَمِينَ ﴿۶۴﴾

وَلِإِيَادِ أَخَاهُمْ هُودًا قَالَ يَقَوْمِ اعْبُدُوا اللَّهَ مَا لَكُمْ
مِنَ إِلَهِ غَيْرِهِ أَفَلَا تَتَّقُونَ ﴿۶۵﴾

قَالَ الْمَلَائِكَةُ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ قَوْمِهِ إِنَّا لَنَرُكَ فِي
سَفَاهَةٍ وَإِنَّا لَنَظُنُّكَ مِنَ الْكَاذِبِينَ ﴿۶۶﴾

قَالَ يَقَوْمِ لَيْسَ بِي سَفَاهَةٌ وَلَكِنِّي رَسُولٌ مِّنْ

کے صالحین فوت ہو گئے تو ان کے عقیدت مندوں نے ان پر سجدہ گاہیں (عبادت خانے) قائم کر دیں اور ان کی تصویریں بھی وہاں لٹکادیں، مقصد ان کا یہ تھا کہ اس طرح ان کی یاد سے وہ بھی اللہ کا ذکر کریں گے اور ذکر الہی میں ان کی مشابہت اختیار کریں گے۔ جب کچھ وقت گزرا تو انہوں نے ان تصویروں کے مجتہسے بنا دیئے اور پھر کچھ اور عرصہ گزرنے کے بعد یہ مجتہسے بتوں کی شکل اختیار کر گئے اور ان کی پوجا پاٹ شروع ہو گئی اور قوم نوح کے یہ صالحین و ذُ سُوَاعِ يَعُوْقُ، يَعُوْقُثُ اور نَسْرُ مَعْبُودِ بْنِ گئے۔ ان حالات میں اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام کو ان میں نبی بنا کر بھیجا جنہوں نے ساڑھے نو سو سال تبلیغ کی۔ لیکن تھوڑے سے لوگوں کے سوا کسی نے آپ کی تبلیغ کا اثر قبول نہیں کیا بالآخر اہل ایمان کے سوا سب کو غرق کر دیا گیا۔ اس آیت میں بتلایا جا رہا ہے کہ قوم نوح نے اس بات پر تعجب کا اظہار کیا کہ ان ہی میں کا ایک آدمی نبی بن کر آ گیا جو انہیں اللہ کے عذاب سے ڈرا رہا ہے؟ یعنی ان کے خیال میں نبوت کے لئے انسان موزوں نہیں۔

(۱) یعنی حق سے، حق کو دیکھتے تھے نہ اسے اپنانے کے لئے تیار تھے۔

(۲) یہ قوم عاد، عاد اولیٰ ہے جن کی رہائش یمن میں ریتلے پہاڑوں میں تھی اور اپنی قوت و طاقت میں بے مثال تھی۔ ان کی طرف حضرت ہود علیہ السلام، جو اسی قوم کے ایک فرد تھے، نبی بن کر آئے۔

(۳) یہ کم عقلی ان کے نزدیک یہ تھی کہ بتوں کو چھوڑ کر، جن کی عبادت ان کے آبا و اجداد سے ہوتی آرہی تھی، اللہ واحد کی عبادت کی طرف دعوت دی جا رہی ہے۔

رَبِّ الْعَالَمِينَ ۝

عقلی نہیں لیکن میں پروردگار عالم کا بھیجا ہوا پیغمبر ہوں۔ (۶۷)

تم کو اپنے پروردگار کے پیغام پہنچاتا ہوں اور میں تمہارا امانتدار خیر خواہ ہوں۔ (۶۸)

اور کیا تم اس بات سے تعجب کرتے ہو کہ تمہارے پروردگار کی طرف سے تمہارے پاس ایک ایسے شخص کی معرفت، جو تمہاری ہی جنس کا ہے کوئی نصیحت کی بات آگئی تاکہ وہ شخص تم کو ڈرائے اور تم یہ حالت یاد کرو کہ اللہ نے تم کو قوم نوح کے بعد جانشین بنایا اور ذیل ذول میں تم کو پھیلاؤ زیادہ دیا،^(۱) سو اللہ کی نعمتوں کو یاد کرو تا کہ تم کو فلاح ہو۔ (۶۹)

انہوں نے کہا کہ کیا آپ ہمارے پاس اس واسطے آئے ہیں کہ ہم صرف اللہ ہی کی عبادت کریں اور جن کو ہمارے باپ دادا پوجتے تھے ان کو چھوڑ دیں،^(۲) پس ہم کو جس عذاب کی دھمکی دیتے ہو اس کو ہمارے پاس منگوا دو اگر تم سچے ہو۔^(۳) (۷۰)

أَبَلْعَلَّمْتُمْ رَسُولِي رَبِّي وَإِنَّا لَكُم نَاصِحٌ أَمِينٌ ۝

أَوْحَيْنَا أَنْ جَاءَكُمْ ذِكْرُنَا رَبِّيكُمْ عَلَىٰ رَجُلٍ مِّنكُمْ لِيُنذِرَكُمْ وَأَذْكُرُوا الَّذِي جَعَلَكُمْ خُلَفَاءَ مِن بَعْدِي قَوْمِ نُوحٍ وَزَادَكُمْ فِي الْخَلْقِ بَضْطَةً، فَاذْكُرُوا الْآيَةَ اللَّهُ لَعَلَّكُمْ تَفْلِحُونَ ۝

قَالُوا أَجِئْنَا لِنُعْبُدَ اللَّهَ وَحْدَهُ وَنَذَرَمَا كَانَ يَعْبُدُ آبَاؤُنَا قَاتِلِينَ إِيمَانًا يَعِدُونَ تَارَانًا كُنْتُم مِّنَ الضَّالِّينَ ۝

(۱) ایک دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ نے ان کی بابت فرمایا ﴿لَمْ يُخَلِّقْ مِثْلَهَا فِي الْبِلَادِ﴾ (الفجر-۸) ”اس جیسی قوت والی قوم پیدا نہیں کی گئی“ اپنی اسی قوت کے گھمنڈ میں مبتلا ہو کر اس نے کہا مِّنْ أَشَدُّ مَنَا قُوَّةً ”ہم سے زیادہ طاقت ور کون ہے؟“ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ”جس نے انہیں پیدا کیا ہے وہ ان سے بہت زیادہ قوت والا ہے“ (حم سجدہ-۱۵)

(۲) آباؤ اجداد کی تقلید، ہر دور میں گمراہی کی بنیاد رہی ہے۔ قوم عادی نے بھی یہی ”دلیل“ پیش کی اور شرک کو چھوڑ کر توحید کا راستہ اختیار کرنے پر آمادہ نہیں ہوئے۔ بد قسمتی سے مسلمانوں میں بھی اپنے بڑوں کی تقلید کی یہ بیماری عام ہے۔

(۳) جس طرح قریش نے بھی رسول اللہ ﷺ کی دعوت توحید کے جواب میں کہا تھا۔ ﴿اللَّهُمَّ إِنَّ كَانَ هَذَا هُوَ الْحَقُّ مِنْ عِنْدِكَ فَأَمْطِرْ عَلَيْنَا حِجَارَةً مِّنَ السَّمَاءِ أَوْ اثْبِتْنَا بِعَذَابِ الْبُغْيِ﴾ (الأنفال-۳۲) ”اے اللہ! اگر یہ حق ہے تیری طرف سے تو ہم پر آسمان سے پتھروں کی بارش برسایا کوئی اور دردناک عذاب ہم پر بھیج دے“۔ یعنی شرک کرتے کرتے مشرک کی مت بھی ماری جاتی ہے۔ حالانکہ عقل مندی کا تقاضا یہ تھا کہ یہ کہا جاتا یا اللہ اگر یہ سچ ہے اور تیری ہی طرف سے ہے تو ہمیں اسے قبول کرنے کی توفیق عطا فرما۔ بہر حال قوم عادی نے اپنے پیغمبر حضرت ہود علیہ السلام سے کہہ دیا کہ اگر تو سچا ہے تو اپنے اللہ سے کہہ جس عذاب سے وہ ڈراتا ہے، بھیج دے۔

قَالَ قَدْ وَقَعَتْ عَلَيْكُمْ مِنْ رَبِّكُمْ رَجْسٌ وَغَضَبٌ
أَجْمَادٌ لَوْ نَفِئْتُمْ فِي أَسْمَاءِ سَمَيْتُمْوهَا أَنْتُمْ وَأَبَاؤُكُمْ مَا
نَزَلَ اللَّهُ بِهَا مِنْ سُلْطِينَ فَاذْكُرُوا لِلَّهِ مَا كُنْتُمْ تَعْبُدُونَ
الْمُنْتَظِرِينَ ﴿۱﴾

انہوں نے فرمایا کہ بس اب تم پر اللہ کی طرف سے
عذاب^(۱) اور غضب آیا ہی چاہتا ہے کیا تم مجھ سے ایسے
ناموں کے باب میں جھگڑتے ہو^(۲) جن کو تم نے اور
تمہارے باپ دادوں نے ٹھہرا لیا ہے؟ ان کے معبود
ہونے کی اللہ نے کوئی دلیل نہیں بھیجی۔ سو تم منتظر رہو
میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کر رہا ہوں۔ (۷۱)

فَأَجْبِدْنَهُ وَالَّذِينَ مَعَهُ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا وَقَطَّعْنَا دَائِرَةَ
الَّذِينَ كَفَرُوا بِآيَاتِنَا وَمَا كَانُوا مُؤْمِنِينَ ﴿۲﴾

غرض ہم نے ان کو اور ان کے ساتھیوں کو اپنی رحمت
سے بچا لیا اور ان لوگوں کی جڑ کاٹ دی، جنہوں نے
ہماری آیتوں کو جھٹلایا تھا اور وہ ایمان لانے والے نہ
تھے۔^(۳) (۷۲)

وَالِى شِمُودَ أَخَاهُمْ صَالِحًا قَالَ يَاقَوْمِ اعْبُدُوا اللَّهَ مَا
لَكُمْ مِنْ إِلَهٍ غَيْرُهُ قَدْ جَاءَكُمْ بَيِّنَةٌ مِنْ رَبِّكُمْ

اور ہم نے شموذ کی طرف ان کے بھائی صالح (علیہ السلام)
کو بھیجا۔^(۳) انہوں نے فرمایا اے میری قوم! تم اللہ کی

(۱) رَجْسٌ کے معنی توپلیدی کے ہیں۔ لیکن یہاں یہ مقلوب (بدلا ہوا) ہے رَجْزٌ سے۔ جس کے معنی عذاب کے ہیں۔ یا
پھر رَجْسٌ یہاں ناراضی اور غضب کے معنی میں ہے۔ (ابن کثیر)

(۲) اس سے مراد وہ نام ہیں جو انہوں نے اپنے معبودوں کے رکھے ہوئے تھے، مثلاً صَدًا صُمُودُ، هَبَا۔ وغیرہ جیسے قوم
نوح کے پانچ بہت تھے جن کے نام اللہ نے قرآن میں ذکر کئے ہیں جیسے مشرکین عرب کے بتوں کے نام تھے۔ لَاتٌ، عَزَّى
مَنَاثٌ، هُبَلٌ وغیرہ یا جیسے آج کل کے مشرکانہ عقائد و اعمال میں ملوث لوگوں نے نام رکھے ہوئے ہیں۔ مثلاً ”داتا گنج
بخش“ ”خواجہ غریب نواز“ ”بابا فرید شکر گنج“ ”مشکل کشا“ وغیرہ جن کے معبود یا مشکل کشا و گنج بخش وغیرہ ہونے کی کوئی
دلیل ان لوگوں کے پاس نہیں ہے۔

(۳) اس قوم پر باد تند کا عذاب آیا جو سات راتیں اور آٹھ دن مسلسل جاری رہا، جس نے ہر چیز کو تہس نہس کر کے
رکھ دیا اور یہ قوم عاد کے لوگ، جنہیں اپنی قوت پر بڑا ناز تھا، ان کے لاشے کھجور کے کٹے ہوئے تنوں کی طرح زمین پر
پڑے نظر آتے تھے۔ (دیکھئے سورۃ الحاقۃ۔ ۶-۸، سورۃ ہود۔ ۵۳-۵۶، سورۃ احقاف۔ ۲۳-۲۵، وغیرہا من الآیات)

(۴) یہ شموذ، حجاز اور شام کے درمیان وادی القریٰ میں رہائش پذیر تھے۔ ۹/ ہجری میں تبوک جاتے ہوئے رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ اللہ علیہم وسلم کا ان کے مساکن اور وادی سے گزر ہوا، جس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ اللہ علیہم وسلم سے فرمایا
کہ معذب قوموں کے علاقے سے گزرو تو روتے ہوئے یعنی عذاب الہی سے پناہ مانگتے ہوئے گزرو (صحیح بخاری)
کتاب الصلوٰۃ باب الصلوٰۃ فی مواضع الخسف، صحیح مسلم، کتاب الزہد، باب لاندخلوا مساکن

عبادت کرو اس کے سوا کوئی تمہارا معبود نہیں۔ تمہارے پاس تمہارے پروردگار کی طرف سے ایک واضح دلیل آچکی ہے۔ یہ اونٹنی ہے اللہ کی جو تمہارے لئے دلیل ہے سو اس کو چھوڑ دو کہ اللہ تعالیٰ کی زمین میں کھاتی پھرے اور اسکو برائی کے ساتھ ہاتھ بھی مت لگانا کہ کہیں تم کو دردناک عذاب آپکڑے۔ (۷۳)

اور تم یہ حالت یاد کرو کہ اللہ تعالیٰ نے تم کو عاد کے بعد جانشین بنایا اور تم کو زمین پر رہنے کا ٹھکانا دیا کہ نرم زمین پر محل بناتے ہو^(۱) اور پہاڑوں کو تراش تراش کر ان میں گھر بناتے ہو،^(۲) سو اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو یاد کرو اور زمین میں فساد مت پھیلاؤ۔^(۳) (۷۴)

ان کی قوم میں جو متکبر سردار تھے انہوں نے غریب لوگوں سے جو کہ ان میں سے ایمان لے آئے تھے پوچھا، کیا تم کو اس بات کا یقین ہے کہ صالح (علیہ السلام) اپنے رب کی طرف سے بھیجے ہوئے ہیں؟ انہوں نے کہا کہ

هٰذِهِ نَاقَةُ اللَّهِ لَكُمْ آيَةٌ فَمَذَرُوهَا تَأْكُلُ فِي أَرْضِ اللَّهِ وَلَا تَمْسُوهَا بِسُوءٍ فَيَأْخُذَكُمْ عَذَابُ آيَتِهِ ۝

وَأَذْكُرُوا إِذْ جَعَلْنَا خُلَفَاءَ مِنْ بَعْدِ عَادٍ قَوْمًا كُمْ فِي الْأَرْضِ تَتَّخِذُونَ مِنْ سُوءِهَا بُسُورًا وَتَنْجِسُونَ الْجِبَالَ بَيْوتًا فَادْكُرُوا الْآيَةَ اللَّهُ وَلَا تَعْتَوُوا فِي الْأَرْضِ مُفْسِدِينَ ۝

قَالَ الْمَلَأُ الَّذِينَ اسْتَكْبَرُوا مِنْ قَوْمِهِ لِلَّذِينَ اسْتُضِعُوا مِنَ الْمَنِّ مِنْهُمْ أَنْ يَضِلُّوا قَوْمَهُمْ مِنْ رَيْبِهِ قَالُوا إِنَّا بِنَاءِ أُورِشَلِيمَ

الذین ظلموا انفسهم الا ان تکونوا باکین ان کی طرف حضرت صالح علیہ السلام نبی بنا کر بھیجے گئے۔ یہ عاد کے بعد کا واقعہ ہے۔ انہوں نے اپنے پیغمبر سے مطالبہ کیا کہ پتھر کی چٹان سے ایک اونٹنی نکال کر دکھا، جسے ہم نکلتے ہوئے ہم اپنی آنکھوں سے دیکھیں۔ حضرت صالح علیہ السلام نے ان سے عہد لیا کہ اس کے بعد بھی اگر ایمان نہ لائے تو وہ ہلاک کر دیئے جائیں گے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان کے مطالبے پر اونٹنی ظاہر فرمادی۔ اس اونٹنی کی بابت انہیں تاکید کر دی گئی کہ اسی بری نیت سے کوئی شخص ہاتھ نہ لگائے ورنہ عذاب الہی کی گرفت میں آجاؤ گے۔ لیکن ان ظالموں نے اس اونٹنی کو بھی قتل کر ڈالا، جس کے تین دن بعد انہیں چنگھاڑا صَنِحَةً۔ سخت چیخ اور زَجْفَةً۔ زلزلہ کے عذاب سے ہلاک کر دیا گیا، جس سے وہ اپنے گھروں میں اوندھے کے اوندھے پڑے رہ گئے۔

(۱) اس کا مطلب ہے کہ نرم زمین سے مٹی لے لے کر اینٹیں تیار کرتے ہو اور ان اینٹوں سے محل، جیسے آج بھی بھٹوں پر اسی طرح مٹی سے اینٹیں تیار کی جاتی ہیں۔

(۲) یہ ان کی قوت، صلابت بدن اور مہارت فن کا اظہار ہے۔

(۳) یعنی ان نعمتوں پر اللہ کا شکر کرو اور اس کی اطاعت کا راستہ اختیار کرو، نہ کہ کفران نعمت اور معصیت کا ارتکاب کر کے فساد پھیلاؤ۔

مُؤْمِنُونَ ⑥

قَالَ الَّذِينَ اسْتَكْبَرُوا إِنَّا بِالَّذِي آمَنْتُمْ بِهِ
كٰفِرُونَ ⑥

فَعَقَرُوا وَالثَّاقَةَ وَعَتَوْا عَنْ أَمْرِ رَبِّهِمْ وَقَالُوا
يُضِلُّهُمُ اسْتِنَابَنَا بِمَا كُنَّا نَأْتِيهِمْ لَعَنَ كُنْتُمْ مِنْ
الْمُرْسَلِينَ ⑥

فَأَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ فَأَصْبَعُوا فِي دَارِهِمْ جِثِيمِينَ ⑥

فَتَوَلَّى عَنْهُمْ وَقَالَ يٰ قَوْمٍ لَقَدْ أَبْلَغْتُكُمْ رِسَالَاتِ رَبِّي
وَصَصَحْتُ لَكُمْ وَلَكِنْ لَا تُحِبُّونَ التَّصْحِيحِينَ ⑥

وَلَوْطٰٓءِذْ قَالَ لِقَوْمِهِ اٰتٰٓتُوْنَ الْفٰٓحِشَةَ مَا سَبَقَكُمْ
بِهٰٓءِ مِنْ اٰحَدٍ مِنَ الْعٰلَمِيْنَ ⑥

بے شک ہم تو اس پر پورا یقین رکھتے ہیں جو ان کو دے
کر بھیجا گیا ہے۔ (۷۵)^(۱)

وہ متکبر لوگ کہنے لگے کہ تم جس بات پر یقین لائے
ہوئے ہو، ہم تو اس کے منکر ہیں۔ (۷۶)^(۲)

پس انہوں نے اس اونٹنی کو مار ڈالا اور اپنے پروردگار
کے حکم سے سرکشی کی اور کہنے لگے کہ اے صالح! جس
کی آپ ہم کو دھمکی دیتے تھے اس کو منگوائیے اگر آپ
پیغمبر ہیں۔ (۷۷)

پس ان کو زلزلہ نے آپکڑا (۳) اور وہ اپنے گھروں میں
اوندھے کے اوندھے پڑے رہ گئے۔ (۷۸)

اس وقت (صالح علیہ السلام) ان سے منہ موڑ کر چلے اور
فرمانے لگے (۴) کہ اے میری قوم! میں نے تو تم کو اپنے
پروردگار کا حکم پہنچا دیا تھا اور میں نے تمہاری خیر خواہی کی
لیکن تم لوگ خیر خواہوں کو پسند نہیں کرتے۔ (۷۹)

اور ہم نے لوط (علیہ السلام) کو بھیجا (۵) جبکہ انہوں نے اپنی
قوم سے فرمایا کہ تم ایسا فحش کام کرتے ہو جس کو تم سے پہلے
کسی نے دنیا جہان والوں میں سے نہیں کیا۔ (۸۰)

(۱) یعنی جو دعوت توحید وہ لے کر آئے ہیں، وہ چونکہ فطرت کی آواز ہے، ہم تو اس پر ایمان لے آئے ہیں۔ باقی رہی یہ بات کہ صالح واقعی اللہ کے رسول ہیں؟ جو ان کا سوال تھا، اس سے ان اہل ایمان نے تعرض ہی نہیں کیا۔ کیونکہ ان کے رسول من اللہ ہونے کو وہ بحث کے قابل ہی نہیں سمجھتے تھے۔ ان کے نزدیک ان کی رسالت ایک مسلمہ حقیقت و صداقت تھی۔ جیسا کہ فی الواقع تھی۔

(۲) اس معقول جواب کے باوجود وہ اپنے اسکبار اور انکار پر اڑے رہے۔

(۳) یہاں رَجْفَةٌ (زلزلے) کا ذکر ہے۔ دوسرے مقام پر صَنِيعَةٌ (چیخ) کا۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دونوں قسم کا عذاب ان پر آیا۔ اوپر سے سخت چیخ اور نیچے سے زلزلہ۔ ان دونوں عذابوں نے انہیں تمس نس کر کے رکھ دیا۔

(۴) یہ یا تو ہلاکت سے قبل کا خطاب ہے یا پھر ہلاکت کے بعد اسی طرح کا خطاب ہے جس طرح رسول اللہ ﷺ نے جنگ بدر ختم ہونے کے بعد قلیب بدر میں مشرکین کی لاشوں سے خطاب فرمایا تھا۔

(۵) حضرت لوط علیہ السلام، حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بھتیجے تھے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام پر ایمان لانے والوں

تم مردوں کے ساتھ شہوت رانی کرتے ہو^(۱) عورتوں کو چھوڑ کر،^(۲) بلکہ تم تو حد ہی سے گزر گئے ہو^(۳) (۸۱) اور ان کی قوم سے کوئی جواب نہ بن پڑا، بجز اس کے کہ آپس میں کہنے لگے کہ ان لوگوں کو اپنی بستی سے نکال دو۔ یہ لوگ بڑے پاک صاف بنتے ہیں۔^(۴) (۸۲)

إِنَّكُمْ لَتَأْتُونَ الرِّجَالَ شَهْوَةً مِّنْ دُونِ النِّسَاءِ
بَلْ أَنْتُمْ قَوْمٌ مُّسْرِفُونَ ﴿۸۱﴾
وَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهِ إِلَّا أَنْ قَالُوا أَخْرِجُوهُمْ
مِّنْ قَرْيَتِكُمْ إِنَّهُمْ أَنَاسٌ يَّتَطَهَّرُونَ ﴿۸۲﴾

میں سے تھے پھر خود ان کو بھی اللہ تعالیٰ نے ایک علاقے میں نبی بنا کر بھیجا۔ یہ علاقہ اردن اور بیت المقدس کے درمیان تھا جسے سدوم کہا جاتا ہے۔ یہ زمین سرسبز و شاداب تھی اور یہاں ہر طرح کے غلے اور پھلوں کی کثرت تھی۔ قرآن نے اس جگہ کو مَوْثِقَةً یا مَوْثِقَاتٍ کے الفاظ سے ذکر کیا ہے۔ حضرت لوط علیہ السلام نے غالباً سب سے پہلے یا دعوت توحید کے ساتھ ہی، (جو ہر نبی کی بنیادی دعوت تھی اور سب سے پہلے وہ اسی کی دعوت اپنی قوم کو دیتے تھے۔ جیسا کہ پچھلے نبیوں کے حالات میں، جن کا ذکر ابھی گزرا ہے، دیکھا جاسکتا ہے۔) جو دو سری بڑی خرابی مردوں سے ساتھ بد فعلی، قوم لوط میں تھی، اس کی شاعت و قباحت بیان فرمائی۔ اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ یہ ایک ایسا گناہ ہے جسے دنیا میں سب سے پہلے اسی قوم لوط نے کیا، اس گناہ کا نام ہی لواطت پڑ گیا۔ اس لئے مناسب سمجھا گیا کہ پہلے قوم کو اس جرم کی خطرناکی سے آگاہ کیا جائے۔ علاوہ ازیں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ذریعے دعوت توحید بھی یہاں پہنچ چکی ہوگی۔ لواطت کی سزا میں ائمہ کے درمیان اختلاف ہے۔ بعض ائمہ کے نزدیک اس کی وہی سزا ہے جو زنا کی ہے یعنی مجرم اگر شادی شدہ ہو تو رجم، غیر شادی شدہ ہو تو سو کوڑے۔ بعض کے نزدیک اس کی سزا ہی رجم ہے چاہے مجرم کیسا بھی ہو اور بعض کے نزدیک فاعل اور مفعول بہ دونوں کو قتل کر دینا چاہئے۔ البتہ امام ابو حنیفہ صرف تعزیری سزا کے قائل ہیں، حد کے نہیں (تحفۃ الأحوذی جلد ۵ ص ۱۷)

(۱) یعنی مردوں کے پاس تم اس بے حیائی کے کام کے لئے محض شہوت رانی کی غرض سے آتے ہو، اس کے علاوہ تمہاری اور کوئی غرض ایسی نہیں ہوتی جو موافق عقل ہو۔ اس لحاظ سے وہ بالکل بہائم کی طرح تھے جو محض شہوت رانی کے لئے ایک دوسرے پر چڑھتے ہیں۔

(۲) جو قضائے شہوت کا اصل محل اور حصول لذت کی اصل جگہ ہے۔ یہ ان کی فطرت کے مسخ ہونے کی طرف اشارہ ہے، یعنی اللہ نے مرد کی جنسی لذت کی تسکین کے لئے عورت کی شرم گاہ کو اس کا محل اور موضع بنایا ہے اور ان ظالموں نے اس سے تجاوز کر کے مرد کی دبر کو اس کے لئے استعمال کرنا شروع کر دیا۔

(۳) لیکن اب اسی فطرت صحیحہ سے انحراف اور حدود الہی سے تجاوز کو مغرب کی ”مذہب“ قوموں نے اختیار کر لیا ہے تو یہ انسانوں کا ”بنیادی حق“ قرار پا گیا ہے جس سے روکنے کا کسی کو حق حاصل نہیں ہے۔ چنانچہ اب وہاں لواطت کو قانونی تحفظ حاصل ہو گیا ہے۔ اور یہ سرے سے جرم ہی نہیں رہا۔ فَإِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ۔

(۴) یہ حضرت لوط کو بستی سے نکلنے کی علت ہے۔ باقی ان کی پاکیزگی کا اظہار یا تو حقیقت کے طور پر ہے اور مقصد ان

فَأَجْبَيْنَهُ وَأَهْلَكَ إِلَّا امْرَأَتَهُ كَانَتْ
مِنَ الْغَابِرِينَ ﴿۸۳﴾

سو ہم نے لوط (علیہ السلام) کو اور ان کے گھر والوں کو بچا
لیا۔ بجز ان کی بیوی کے کہ وہ ان ہی لوگوں میں رہی جو
عذاب میں رہ گئے تھے۔ (۸۳) ^(۱)

وَأَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ مَطَرًا قَانظِرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ
الْمُجْرِمِينَ ﴿۸۴﴾

اور ہم نے ان پر خاص طرح کا مینہ ^(۲) برسایا پس دیکھو تو
سہی ان مجرموں کا انجام کیسا ہوا؟ (۸۴) ^(۳)

وَالِى مَدْيَنَ أَخَاهُمْ شُعَيْبًا قَالَ يَا قَوْمِ اعْبُدُوا اللَّهَ
مَا لَكُمْ مِّنْ إِلَٰهٍ غَيْرُهُ قَدْ جَاءَكُمْ بَيِّنَاتٌ مِّنْ
رَّبِّكُمْ فَأَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيزَانَ وَلَا تَبْخُسُوا النَّاسَ
أَشْيَاءَهُمْ وَلَا تُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ بَعْدَ إِصْلَاحِهَا

اور ہم نے مدین کی طرف ان کے بھائی شعیب (علیہ
السلام) کو بھیجا۔ ^(۳) انہوں نے فرمایا اے میری قوم! تم اللہ
کی عبادت کرو اسکے سوا کوئی تمہارا معبود نہیں، تمہارے
پاس تمہارے پروردگار کی طرف سے واضح دلیل آچکی
ہے۔ پس تم ناپ اور تول پورا پورا کیا کرو اور لوگوں کو ان

کا یہ ہو کہ یہ لوگ اس برائی سے بچنا چاہتے ہیں، اس لئے بہتر ہے کہ یہ ہمارے ساتھ ہماری بستی ہی میں نہ رہیں یا استہزا
اور تمسخر کے طور پر انہوں نے ایسا کہا۔

(۱) إِنَّهَا كَانَتْ مِنَ الْبَاقِينَ فِي عَذَابِ اللَّهِ. یعنی وہ ان لوگوں میں باقی رہ گئی جن پر اللہ کا عذاب آیا۔ کیونکہ وہ بھی
مسلمان نہیں تھی اور اس کی ہمدردیاں بھی مجرمین کے ساتھ تھیں بعض نے اس کا ترجمہ ”ہلاک ہونے والوں میں سے“
کیا ہے۔ لیکن یہ لازمی معنی ہیں، اصل معنی وہی ہیں۔

(۲) یہ خاص طرح کا مینہ کیا تھا؟ پتھروں کا مینہ جس طرح دوسرے مقام پر فرمایا ﴿وَأَمْطَرْنَا عَلَيْهَا حِجَارًا مِّنْ سِجِّيلٍ
مَّنصُودٍ﴾ (ہود-۸۲) ”ہم نے ان پر تہ بہ تہ پتھروں کی بارش برسائی“ اس سے پہلے فرمایا ﴿جَعَلْنَا عَلَيْهِمْ سَاقِلَةً
”ہم نے اس بستی کو الٹ کر نیچے اوپر کر دیا۔“

(۳) یعنی اے محمد (ﷺ)! دیکھئے تو سہی، جو لوگ علانیہ اللہ کی معاصی کا ارتکاب اور پیغمبروں کی تکذیب کرتے ہیں، ان
کا انجام کیا ہوتا ہے؟

(۳) مدین حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بیٹے یا پوتے کا نام تھا، پھر انہی کی نسل پر بنی قبیلے کا نام بھی مدین اور جس بستی
میں یہ رہائش پذیر تھے، اس کا نام بھی مدین پڑ گیا۔ یوں اس کا اطلاق قبیلے اور بستی دونوں پر ہوتا ہے۔ یہ بستی حجاز کے
راستے میں ”معان“ کے قریب ہے۔ انہی کو قرآن میں دوسرے مقام پر أَصْحَابُ الْأَيْكَةِ (بن کے رہنے والے) بھی
کہا گیا ہے۔ ان کی طرف حضرت شعیب علیہ السلام نبی بنا کر بھیجے گئے۔ (دیکھئے الشعراء: ۶۷، ۷۰، ۷۱، ۷۲، ۷۳)

طحاوی: ہر نبی کو اس قوم کا بھائی کہا گیا ہے، جس کا مطلب اسی قوم اور قبیلے کا فرد ہے، جس کو بعض جگہ دَسُؤَلَا مِّنْهُمْ یا مَنِ
أَنْفُسِهِمْ سے بھی تعبیر کیا گیا ہے اور مطلب ان سب کا یہ ہے کہ رسول اور نبی انسانوں میں سے ہی ایک انسان ہوتا ہے جسے
اللہ تعالیٰ لوگوں کی ہدایت کے لئے چن لیتا ہے اور وحی کے ذریعے سے اس پر اپنی کتاب اور احکام نازل فرماتا ہے۔

ذَلِكَ خَيْرٌ لَّكُمْ إِن كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ ۝

کی چیزیں کم کر کے مت^(۱) دو اور روئے زمین میں اس کے بعد کہ اسکی درستی کر دی گئی، فساد مت پھیلاؤ، یہ تمہارے لئے نافع ہے اگر تم تصدیق کرو۔ (۸۵)

اور تم سڑکوں پر اس غرض سے مت بیٹھا کرو کہ اللہ پر ایمان لانے والے کو دھمکیاں دو اور اللہ کی راہ سے روکو اور اس میں کجی کی تلاش میں لگے رہو۔^(۲) اور اس حالت کو یاد کرو جب کہ تم کم تھے پھر اللہ نے تم کو زیادہ کر دیا اور دیکھو کہ کیسا انجام ہوا فساد کرنے والوں کا۔ (۸۶)

اور اگر تم میں سے کچھ لوگ اس حکم پر، جس کو دے کر مجھ کو بھیجا گیا، ایمان لے آئے ہیں اور کچھ ایمان نہیں لائے ہیں تو ذرا ٹھہر جاؤ! یہاں تک کہ ہمارے درمیان اللہ فیصلہ کئے دیتا ہے اور وہ سب فیصلہ کرنے والوں سے بہتر ہے^(۳)۔ (۸۷)

وَلَا تَقْعُدُوا بِكُلِّ صِرَاطٍ تُوعِدُونَ وَتَصُدُّونَ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ مَن آمَنَ بِهِ وَتَبْغُونَهَا عِوَجًا ۚ وَأَذْكُرُوا إِذْ كُنْتُمْ قَلِيلًا فَكَفَرْتُمْ ۚ وَانظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِينَ ۝

وَإِن كَانَ ظَلُوفُهُ مِّنْكُمْ أَمْنُوا بِآلِدِيهِ
أُرْسِلَتْ بِهِ وَظُلُوفُهُ لَمْ يُؤْمِنُوا فَأَصْبِرُوا ۚ حَتَّى
يَحْكُمَ اللَّهُ بَيْنَنَا ۚ وَهُوَ خَيْرُ الْحَاكِمِينَ ۝

(۱) دعوت توحید کے بعد، اس قوم میں ناپ تول میں کمی کی جو بڑی خرابی تھی، اس سے اسے منع فرمایا اور پورا پورا ناپ اور تول کر دینے کی تلقین کی۔ یہ کو تاہی بھی بہت خطرناک ہے جس سے اس قوم کی اخلاقی پستی اور گراؤ کا پتہ چلتا ہے جس کے اندر یہ ہو۔ یہ بدترین خیانت ہے کہ پیسے پورے لئے جائیں اور چیز کم دی جائے۔ اسی لئے سورہ مطففین میں ایسے لوگوں کی ہلاکت کی خبر دی گئی ہے۔

(۲) اللہ کے راستے سے روکنے کے لئے اللہ کے راستے میں کجیاں تلاش کرنا۔ یہ ہر دور کے نافرمانوں کا محبوب مشغلہ رہا ہے جس کے نمونے آج کل کے متجددین اور فرنگیت زہہ لوگوں میں بھی نظر آتے ہیں۔ اَعَاذَنَا اللَّهُ مِنْهُ۔ علاوہ ازیں راستے میں بیٹھنے کے اور بھی کئی مفہوم بیان کئے گئے ہیں۔ مثلاً لوگوں کو ستانے کے لئے بیٹھنا، جیسے عام طور پر ادبائش قسم کے لوگوں کا شیوہ ہے۔ یا حضرت شعیب علیہ السلام کی طرف جانے والے راستوں میں بیٹھنا تاکہ ان کے پاس جانے والوں کو روکیں اور ان سے انہیں بدظن کریں، جیسے قریش مکہ کرتے تھے یا دین کے راستوں پر بیٹھنا اور اس راہ پر چلنے والوں کو روکنا۔ یوں لوٹ مار کی غرض سے ناکوں پر بیٹھنا تاکہ آنے جانے والوں کا مال سلب کر لیں۔ یا بعض کے نزدیک محصول اور چنگی وصول کرنے کے لئے ان کا راستوں پر بیٹھنا۔ امام شوکانی فرماتے ہیں کہ سارے ہی مفہوم صحیح ہو سکتے ہیں کیونکہ یہ ممکن ہے کہ وہ یہ سب ہی کچھ کرتے ہوں (فتح القدر)۔

(۳) کفر پر صبر کرنے کا حکم نہیں ہے بلکہ اسکے لیے تمہید اور سخت وعید ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فیصلہ اہل حق کا اہل باطل پر فتح و غلبہ ہی ہوتا ہے۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے دوسرے مقام پر فرمایا: ﴿فَلْيَصْوَراً إِنَّا مَعَكُمْ مُّتَّصُونَ﴾ (النوبة۔ ۵۲)

ان کی قوم کے متکبر سرداروں نے کہا کہ اے شعیب! ہم آپ کو اور جو آپ کے ہمراہ ایمان والے ہیں ان کو اپنی بستی سے نکال دیں گے الایہ کہ تم ہمارے مذہب میں پھر آ جاؤ۔^(۱) شعیب (علیہ السلام) نے جواب دیا کہ کیا ہم تمہارے مذہب میں آ جائیں گو ہم اس کو مکروہ ہی سمجھتے ہوں۔^(۲) (۸۸)

ہم تو اللہ تعالیٰ پر بڑی جھوٹی تہمت لگانے والے ہو جائیں گے اگر ہم تمہارے دین میں آ جائیں اس کے بعد کہ اللہ تعالیٰ نے ہم کو اس سے نجات دی^(۳) اور ہم سے ممکن نہیں کہ تمہارے مذہب میں پھر آ جائیں، لیکن ہاں یہ کہ اللہ ہی نے جو ہمارا مالک ہے مقدر کیا ہو۔^(۴) ہمارے رب کا علم ہر چیز کو محیط ہے، ہم اللہ ہی پر

قَالَ الْمَلَأُ الَّذِينَ اسْتَكْبَرُوا مِنْ قَوْمِهِ لَنُفِرَّجَنَّكَ يَشْعِيبُ وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَكَ مِنْ قَوْمِنَا آلَتْغُودُونَ فِي رَبِّنَا قَالَ أَوَلَوْ كُنَّا كُرْهِينَ ۝

قَدِ افْتَرَيْنَا عَلَى اللَّهِ كَذِبًا إِنْ عُدْنَا فِي مِلْكِكُمْ بَعْدَ إِذْ جَعَلْنَا اللَّهَ مِنْهَا وَمَا يَكُونُ لَنَا أَنْ نَعُودَ فِيهَا إِلَّا أَنْ يَشَاءَ اللَّهُ رَبُّنَا وَسِعَ رَبُّنَا كُلَّ شَيْءٍ عِلْمًا عَلَى اللَّهِ تَوَكَّلْنَا رَبُّنَا أَفَمَنْ بَيْنَنَا وَبَيْنَ قَوْمِنَا بِالْحَقِّ وَأَنْتَ خَيْرُ الْفَاتِحِينَ ۝

(۱) ان سرداروں کے تکبر اور سرکشی کا اندازہ کیجئے کہ انہوں نے ایمان و توحید کی دعوت کو ہی رد نہیں کیا بلکہ اس سے بھی تجاوز کر کے اللہ کے پیغمبر اور اس پر ایمان لانے والوں کو دھمکی دی کہ یا تو اپنے آبائی مذہب پر واپس آ جاؤ، نہیں تو ہم تمہیں یہاں سے نکال دیں گے۔ اہل ایمان کے اپنے سابق مذہب کی طرف واپسی کی بات تو قابل فہم ہے، کیونکہ انہوں نے کفر چھوڑ کر ایمان اختیار کیا تھا۔ لیکن حضرت شعیب علیہ السلام کو بھی ملت آبائی کی طرف لوٹنے کی دعوت اس لحاظ سے تھی کہ وہ انہیں بھی نبوت اور تبلیغ و دعوت سے پہلے اپنا مذہب ہی سمجھتے تھے، گو حقیقتاً ایسا نہ ہو۔ یا بطور تغلیب انہیں بھی شامل کر لیا ہو۔

(۲) یہ سوال مقدر کا جواب ہے اور ہمزہ انکار کے لیے اور واو حالیہ ہے۔ یعنی کیا تم ہمیں اپنے مذہب کی طرف لوٹاؤ گے یا ہمیں اپنے بستی سے نکال دو گے در آل حالیکہ ہم اس مذہب کی طرف لوٹنا اور اس بستی سے نکلنا پسند نہ کرتے ہوں؟ مطلب یہ ہے کہ تمہارے لیے یہ بات مناسب نہیں ہے کہ تم ہمیں ان میں سے کسی ایک بات کے اختیار کرنے پر مجبور کرو۔

(۳) یعنی اگر ہم دوبارہ اس دین آبائی کی طرف لوٹ آئے، جس سے اللہ نے ہمیں نجات دی، تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ ہم نے ایمان و توحید کی دعوت دے کر اللہ پر جھوٹ باندھا تھا؟ مطلب یہ تھا کہ یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ ہماری طرف سے ایسا ہو۔

(۴) اپنا عزم ظاہر کرنے کے بعد معاملہ اللہ کی مشیت کے سپرد کر دیا۔ یعنی ہم تو اپنی رضا مندی سے اب کفر کی طرف

بھروسہ رکھتے ہیں۔^(۱) اے ہمارے پروردگار! ہمارے اور ہماری قوم کے درمیان حق کے موافق فیصلہ کر دے اور تو سب سے اچھا فیصلہ کرنے والا ہے۔^(۲) (۸۹)

اور ان کی قوم کے کافر سرداروں نے کہا کہ اگر تم شعیب (علیہ السلام) کی راہ پر چلو گے تو بے شک بڑا نقصان اٹھاؤ گے۔^(۳) (۹۰)

پس ان کو زلزلے نے آپکڑا سو وہ اپنے گھروں میں اوندھے کے اوندھے پڑے رہ گئے۔^(۴) (۹۱)

جنہوں نے شعیب (علیہ السلام) کی تکذیب کی تھی ان کی یہ حالت ہو گئی جیسے ان گھروں میں کبھی بے ہی

وَقَالَ الْمَلَأُ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ قَوْمِهِ لِيَنَّ اللَّهُ لَكُمْ شُعَيْبًا
إِنْ كُنْتُمْ إِذْ آخِرُونَ ﴿۹۰﴾

فَأَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ فَأَصْبَحُوا فِي دَارِهِمْ جُثَمِينَ ﴿۹۱﴾

الَّذِينَ كَذَّبُوا شُعَيْبًا كَانُوا لَمْ يَكُنُوا فِيهَا الَّذِينَ كَذَّبُوا

نہیں لوٹ سکتے۔ ہاں اگر اللہ چاہے تو بات اور ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ یہ ﴿حَتَّىٰ يَلِيَّهَا الْجَمَلُ فِي مَسِيرِ الْخَيْلِ﴾ کی طرح تعلق بالحوال ہے۔

(۱) کہ وہ ہمیں ایمان پر ثابت رکھے گا اور ہمارے اور کفر و اہل کفر کے درمیان حائل رہے گا، ہم پر اپنی نعمت کا اتمام فرمائے گا اور اپنے عذاب سے محفوظ رکھے گا۔

(۲) اور اللہ جب فیصلہ کر لیتا ہے تو وہ یہی ہوتا ہے کہ اہل ایمان کو بچا کر مکذبین اور متکبرین کو ہلاک کر دیتا ہے۔ یہ گویا عذاب الہی کے نزول کا مطالبہ ہے۔

(۳) اپنے آبائی مذہب کو چھوڑنا اور ناپ تول میں کمی نہ کرنا، یہ ان کے نزدیک خسارے والی بات تھی درآں حالیکہ ان دونوں باتوں میں ان ہی کا فائدہ تھا۔ لیکن دنیا والوں کی نظر میں تو نفع عاجل (دنیا میں فوراً حاصل ہو جانے والا نفع) ہی سب کچھ ہوتا ہے جو ناپ تول میں ڈنڈی مار کر انہیں حاصل ہو رہا تھا، وہ اہل ایمان کی طرح آخرت کے نفع آجمل (دیر میں ملنے والے نفع) کے لیے اسے کیوں چھوڑتے؟۔

(۴) یہاں رَجْفَةٌ (زلزلہ) کا لفظ آیا ہے اور سورہ ہود آیت ۹۴ میں صَبِيحَةٌ (جیح) کا لفظ ہے اور سورہ شعراء-۱۸۹ میں ظُلَّةٌ (بادل کا سایہ) کے الفاظ ہیں۔ امام ابن کثیر فرماتے ہیں کہ عذاب میں ساری ہی چیزوں کا اجتماع ہوا۔ یعنی سائے والے دن ان پر عذاب آیا۔ پہلے بادل نے ان پر سایہ کیا جس میں شعلے، چنگاریاں اور آگ کے بھبھوکے تھے، پھر آسمان سے سخت جیح آئی اور زمین سے بھونچال، جس سے ان کی روہیں پرواز کر گئیں اور بے جان لاشے ہو کر پرندوں کی طرح گھنٹوں میں منہ دے کر اوندھے کے اوندھے پڑے رہ گئے۔

شُعَيْبًا كَانُوا هُمُ الْخَيْرِينَ ﴿۹۲﴾

نہ تھے۔^(۱) جنہوں نے شعیب (علیہ السلام) کی تکذیب کی تھی وہی خسارے میں پڑ گئے۔^(۲) (۹۲)

اس وقت شعیب (علیہ السلام) ان سے منہ موڑ کر چلے اور فرمانے لگے کہ اے میری قوم! میں نے تم کو اپنے پروردگار کے احکام پہنچا دیئے تھے اور میں نے تمہاری خیر خواہی کی۔ پھر میں ان کافر لوگوں پر کیوں رنج کروں۔^(۳) (۹۳)

اور ہم نے کسی بستی میں کوئی نبی نہیں بھیجا کہ وہاں کے رہنے والوں کو ہم نے سختی اور تکلیف میں نہ پکڑا ہو تاکہ وہ گڑگڑائیں۔^(۴) (۹۴)

پھر ہم نے اس بد حالی کی جگہ خوش حالی بدل دی، یہاں تک کہ ان کو خوب ترقی ہوئی اور کہنے لگے کہ ہمارے آبا و اجداد کو بھی تنگی اور راحت پیش آئی تھی تو ہم نے ان کو دفعاً پکڑ لیا^(۵) اور ان کو خبر بھی نہ تھی۔ (۹۵)

فَتَوَلَّى عَنْهُمْ وَقَالَ يَا قَوْمِ لَقَدْ أَبْلَغْتُكُمْ رَسُولِي رَبِّ
وَلَصَحَّتْ لَكُمْ فُكَيْفَ أَلْسِي عَلَى قَوْمٍ كَافِرِينَ ﴿۹۳﴾

وَمَا أَرْسَلْنَا فِي قَرْيَةٍ مِّنْ نَّبِيٍّ إِلَّا أَخَذْنَا أَهْلَهَا بِالْبَأْسَاءِ
وَالضَّرَّاءِ لَعَلَّهُمْ يَضُّرَّعُونَ ﴿۹۴﴾

ثُمَّ بَدَّلْنَا مَكَانَ السَّيِّئَةِ الْحَسَنَةَ حَتَّىٰ عَفَوا وَقَالُوا قَدْ مَسَّ
آبَاءَنَا الضَّرَّاءُ وَالسَّرَّاءُ فَأَخَذْنَاهُمْ بَغْتَةً وَهُمْ لَا يَشْعُرُونَ ﴿۹۵﴾

(۱) یعنی جس بستی سے یہ اللہ کے رسول اور ان کے پیروکاروں کو نکالنے پر تلے ہوئے تھے، اللہ کی طرف سے عذاب نازل ہونے کے بعد ایسے ہو گئے جیسے وہ یہاں رہتے ہی نہ تھے۔

(۲) یعنی خسارے میں وہی لوگ رہے جنہوں نے پیغمبر کی تکذیب کی، نہ کہ پیغمبر اور ان پر ایمان لانے والے۔ اور خسارہ بھی دونوں جہانوں میں۔ دنیا میں بھی ذلت کا عذاب چکھا اور آخرت میں اس سے کہیں زیادہ عذاب شدید ان کے لیے تیار ہے۔

(۳) عذاب و تباہی کے بعد جب وہ وہاں سے چلے، تو انہوں نے فوراً جذبات میں یہ باتیں کہیں۔ اور ساتھ ہی کہا کہ جب میں نے حق تبلیغ ادا کر دیا اور اللہ کا پیغام ان تک پہنچا دیا، تو اب میں ایسے لوگوں پر افسوس کروں تو کیوں کروں؟ جو اس کے باوجود اپنے کفر اور شرک پر ڈٹے رہے۔

(۴) بَأْسَاءُ، وہ تکلیفیں جو انسان کے بدن کو لاحق ہوں یعنی بیماری اور ضَرَّاءُ سے مراد فقر و تنگ دستی۔ مطلب یہ ہے کہ جس کسی بستی میں بھی ہم نے رسول بھیجا، انہوں نے اس کی تکذیب کی جس کی پاداش میں ہم نے ان کو بیماری اور محتاجی میں مبتلا کر دیا جس سے مقصد یہ تھا کہ وہ اللہ کی طرف رجوع کریں اور اس کی بارگاہ میں گڑگڑائیں۔

(۵) یعنی فقر و بیماری کے ابتلا سے بھی جب ان کے اندر رجوع الی اللہ کا داعیہ پیدا نہیں ہوا تو ہم نے ان کی تنگ دستی کو خوش حالی سے اور بیماری کو صحت و عافیت سے بدل دیا تاکہ وہ اس پر اللہ کا شکر ادا کریں۔ لیکن اس انقلاب حال سے بھی

اور اگر ان بستیوں کے رہنے والے ایمان لے آتے اور پرہیزگاری اختیار کرتے تو ہم ان پر آسمان اور زمین کی برکتیں کھول دیتے لیکن انہوں نے تکذیب کی تو ہم نے ان کے اعمال کی وجہ سے ان کو پکڑ لیا۔ (۹۶)

کیا پھر بھی ان بستیوں کے رہنے والے اس بات سے بے فکر ہو گئے ہیں کہ ان پر ہمارا عذاب شب کے وقت آ پڑے جس وقت وہ سوتے ہوں۔ (۹۷)

اور کیا ان بستیوں کے رہنے والے اس بات سے بے فکر ہو گئے ہیں کہ ان پر ہمارا عذاب دن چڑھے آپڑے جس وقت کہ وہ اپنے کھیلوں میں مشغول ہوں۔ (۹۸)

کیا پس وہ اللہ کی اس پکڑ سے بے فکر ہو گئے۔ سو اللہ کی پکڑ سے بجز ان کے جن کی شامت ہی آگئی ہو اور کوئی بے فکر نہیں ہوتا۔^(۱) (۹۹)

وَلَوْ أَنَّ أَهْلَ الْقُرَىٰ آمَنُوا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِم بَرَكَاتٍ مِّنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ وَلَٰكِن كَذَّبُوا فَأَخَذْنَا مِنْهُم مَّا كَانُوا يَكْسِبُونَ ﴿۹۶﴾

أَفَأَمِّنَ أَهْلُ الْقُرَىٰ أَنْ يَأْتِيَهُمْ بَأْسُنَا بَيَاتًا وَهُمْ نَائِمُونَ ﴿۹۷﴾

أَوَأَمِّنَ أَهْلُ الْقُرَىٰ أَنْ يَأْتِيَهُمْ بَأْسُنَا ضَعْفٍ وَهُمْ يَلْعَبُونَ ﴿۹۸﴾

أَفَأَمِنُوا مَكْرَ اللَّهِ فَلَا يَأْمَنُ مَكْرَ اللَّهِ إِلَّا الْقَوْمُ الْخَاسِرُونَ ﴿۹۹﴾

ان کے اندر کوئی تبدیلی نہیں آئی اور انہوں نے کہا کہ یہ تو ہمیشہ سے ہی ہو تا چلا آ رہا ہے کہ کبھی تنگی آگئی کبھی خوش حالی آگئی، کبھی بیماری تو کبھی صحت، کبھی فقیری تو کبھی امیری۔ یعنی تنگ دستی کا پہلا علاج ان کے لیے موثر ثابت ہوا، نہ خوش حالی، ان کے اصلاح احوال کے لیے کارگر ثابت ہوئی۔ وہ اسے لیل و نہار کی گردش ہی سمجھتے رہے اور اس کے پیچھے کار فرما قدرت الہی اور اس کے ارادہ کو سمجھنے میں ناکام رہے تو ہم نے پھر انہیں اچانک اپنے عذاب کی گرفت میں لے لیا۔ اسی لیے حدیث میں مومنوں کا معاملہ اس کے برعکس بیان فرمایا گیا ہے۔ کہ وہ آرام و راحت ملنے پر اللہ کا شکر ادا کرتے ہیں اور تکلیف پہنچنے پر صبر سے کام لیتے ہیں، یوں دونوں ہی حالتیں ان کے لیے خیر اور اجر کا باعث ہوتی ہیں۔ (صحیح مسلم۔ کتاب الزہد باب المؤمن أمرہ کلمہ خیر)

(۱) ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے پہلے یہ بیان فرمایا ہے کہ ایمان و تقویٰ ایسی چیز ہے کہ جس بستی کے لوگ اسے اپنالیں تو ان پر اللہ تعالیٰ آسمان و زمین کی برکتوں کے دروازے کھول دیتا ہے یعنی حسب ضرورت انہیں آسمان سے بارش مہیا فرماتا ہے اور زمین اس سے سیراب ہو کر خوب پیداوار دیتی ہے۔ نتیجتاً خوش حالی و فراوانی ان کا مقدر بن جاتی ہے۔ لیکن اس کے برعکس تکذیب اور کفر کا راستہ اختیار کرنے پر قومیں اللہ کے عذاب کی مستحق ٹھہر جاتی ہیں، پھر پتہ نہیں ہوتا کہ شب و روز کی کس گھڑی میں عذاب آجائے اور ہنستی کھیلتی بستیوں کو آن واحد میں کھنڈر بنا کر رکھ دے۔ اس لیے اللہ کی ان تدبیروں سے بے خوف نہیں ہونا چاہیے۔ اس بے خونی کا نتیجہ سوائے خسارے کے اور کچھ نہیں۔ مکرر کے مفہوم کی وضاحت کے لیے دیکھئے سورہ آل عمران آیت ۵۴ کا حاشیہ۔

اور کیا ان لوگوں کو جو زمین کے وارث ہوئے وہاں کے لوگوں کی ہلاکت کے بعد (ان واقعات مذکورہ نے) یہ بات نہیں بتلائی کہ اگر ہم چاہیں تو ان کے جرائم کے سبب ان کو ہلاک کر ڈالیں اور ہم ان کے دلوں پر بند لگا دیں، پس وہ نہ سن سکیں۔^(۱) (۱۰۰)

ان بستیوں کے کچھ کچھ قصے ہم آپ سے بیان کر رہے ہیں اور ان سب کے پاس ان کے پیغمبر معجزات لے کر آئے،^(۲) پھر جس چیز کو انہوں نے ابتدا میں جھوٹا کہہ دیا یہ بات نہ ہوئی کہ پھر اس کو مان لیتے،^(۳) اللہ تعالیٰ اسی طرح کافروں کے دلوں پر بند لگا دیتا ہے۔ (۱۰۱)

أَوَلَمْ يَهْدِ لِلَّذِينَ يَرْتُونَ الْأَرْضَ مِنْ بَعْدِ أَهْلِهَا
أَنْ لَوْ نَشَاءُ أَصَبْنَهُمْ بِذُنُوبِهِمْ وَنُظَبِّعُ عَلَى قُلُوبِهِمْ
فَهُمْ لَا يَمَعْمُونَ ﴿۱۰۰﴾

تِلْكَ الْقُرَى نَقُضَ عَلَيْكَ مِنْ أَنْبَاءِهَا وَلَعَدَّ جَاءَتْهُمْ
رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنَاتِ فَمَا كَانُوا لِيُؤْمِنُوا بِمَا كَذَّبُوا مِنْ قَبْلُ
كَذَلِكَ يُطَبِّعُ اللَّهُ عَلَى قُلُوبِ الْكَافِرِينَ ﴿۱۰۱﴾

(۱) یعنی گناہوں کے نتیجے میں عذاب ہی نہیں آتا، دلوں پر بھی قفل لگ جاتے ہیں، پھر بڑے بڑے عذاب بھی انہیں خواب غفلت سے بیدار نہیں کر پاتے۔ دیگر بعض مقامات کی طرح یہاں بھی اللہ تعالیٰ نے ایک تو یہ بیان فرمایا ہے کہ جس طرح گزشتہ قوموں کو ہم نے ان کے گناہوں کی پاداش میں ہلاک کیا، ہم چاہیں تو تمہیں بھی تمہارے کرتوتوں کی وجہ سے ہلاک کر دیں اور دوسری بات یہ بیان فرمائی کہ مسلسل گناہوں کے ارتکاب کی وجہ سے لوگوں کے دلوں پر مہر لگا دی جاتی ہے، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ حق کی آواز کے لیے ان کے کان بند ہو جاتے ہیں۔ پھر انذار اور وعظ و نصیحت ان کے لئے بیکار ہو جاتے ہیں۔ آیت میں ہدایت تَبَيِّنُ (وضاحت) کے معنی میں ہے، اسی لئے لام کے ساتھ متعدی ہے۔
أَوَلَمْ يَهْدِ لِلَّذِينَ، یعنی کیا ان پر یہ بات واضح نہیں ہوئی۔

(۲) جس طرح گزشتہ صفحات میں چند انبیاء کا ذکر گزرا۔ بَيِّنَاتٌ سے مراد دلائل و براہین اور معجزات دونوں ہیں۔ مقصد یہ ہے کہ رسولوں کے ذریعے سے جب تک ہم نے حجت تمام نہیں کر دی، ہم نے انہیں ہلاک نہیں کیا۔ کیونکہ ﴿وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِينَ حَتَّىٰ نَبْعَثَ رَسُولًا﴾ (سنی اسرائیل ۱۵) ”جب تک ہم رسول نہیں بھیج دیتے۔ عذاب نازل نہیں کرتے۔“

(۳) اس کا ایک مفہوم تو یہ ہے کہ یوم میثاق کو جب ان سے عہد لیا گیا تھا تو یہ اللہ کے علم میں ایمان لانے والے نہ تھے، اس لیے جب ان کے پاس رسول آئے تو اللہ کے علم کے مطابق ایمان نہیں لائے۔ کیونکہ ان کی تقدیر میں ہی ایمان نہیں تھا جسے اللہ نے اپنے علم کے مطابق لکھ دیا تھا۔ جس کو حدیث میں فَكُلُّ مُنْسَرٍ لِمَا خُلِقَ لَهُ (صحیح بخاری، تفسیر سورۃ اللیل) سے تعبیر کیا گیا ہے دوسرا مفہوم یہ ہے کہ جب پیغمبران کے پاس آئے تو وہ اس وجہ سے ان پر ایمان نہیں لائے کہ وہ اس سے قبل حق کی تکذیب کر چکے تھے۔ گویا ابتداءً جس چیز کی وہ تکذیب کر چکے تھے، یہی گناہ ان کے عدم ایمان کا سبب بن گیا اور ایمان لانے کی توفیق ان سے سلب کر لی گئی، اسی کو اگلے جملے میں مر لگانے سے تعبیر کیا گیا ہے۔ ﴿وَمَا يَشْعُرُكُمْ أَنَّهُمْ إِذَا جَاءَتْهُمُ الرُّسُلُ لَا يُؤْمِنُونَ * وَنُقَلِّبُ أَقْبَادَهُمْ كَمَا لَمْ يُؤْمِنُوا بِهِ أَوَّلَ مَرَّةٍ﴾

اور اکثر لوگوں میں ہم نے وفائے عہد نہ دیکھا^(۱) اور ہم نے اکثر لوگوں کو بے حکم ہی پایا۔ (۱۰۲)

پھر ان کے بعد ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) کو اپنے دلائل دے کر فرعون اور اس کے امرا کے پاس بھیجا،^(۲) مگر ان لوگوں نے ان کا بالکل حق ادا نہ کیا۔ سو دیکھئے ان مفسدوں کا کیا انجام ہوا؟^(۳) (۱۰۳)

اور موسیٰ (علیہ السلام) نے فرمایا کہ اے فرعون! میں رب العالمین کی طرف سے پیغمبر ہوں۔ (۱۰۴)

میرے لئے یہی شایان ہے کہ بجز جج کے اللہ کی طرف کوئی بات منسوب نہ کروں، میں تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے ایک بڑی دلیل بھی لایا ہوں،^(۴) سو تو بنی اسرائیل کو میرے ساتھ بھیج دے۔^(۵) (۱۰۵)

وَمَا وَجَدْنَا لِأَكْثَرِهِمْ مِنْ عَهْدٍ وَإِنْ وَجَدْنَا أَكْثَرَهُمْ لَفَاسِقِينَ ﴿۱۰۲﴾

ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْ بَعْدِهِمُ مُوسَىٰ بِآيَاتِنَا إِلَىٰ فِرْعَوْنَ وَمَلَئِهِ فَظَلَمُوا بِهَا ۖ فَانظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِينَ ﴿۱۰۳﴾

وَقَالَ مُوسَىٰ يُفْرِعُونَ إِنِّي رَسُولٌ مِنْ رَبِّ الْعَالَمِينَ ﴿۱۰۴﴾

حَقِيقٌ عَلَىٰ أَنْ لَا أَقُولَ عَلَى اللَّهِ إِلَّا الْحَقُّ قَدْ جُنْتُكُمْ بِبَيِّنَاتٍ مِنْ رَبِّكُمْ فَأَرْسِلْ مَعِيَ بَنِي إِسْرَائِيلَ ﴿۱۰۵﴾

(الأنعام ۱۰۹، ۱۱۰) ”اور تمہیں کیا معلوم ہے یہ تو ایسے (بد بخت) ہیں کہ ان کے پاس نشانیاں بھی آجائیں تب بھی ایمان نہ لائیں اور ہم ان کے دلوں اور آنکھوں کو الٹ دیں گے (تو) جیسے یہ اس (قرآن) پر پہلی دفعہ ایمان نہیں لائے (ویسے پھر نہ لائیں گے)۔“

(۱) اس سے بعض نے عہد الست، جو عالم ارواح میں لیا گیا تھا، بعض نے عذاب ٹالنے کے لیے پیغمبروں سے جو عہد کرتے تھے، وہ عہد اور بعض نے عام عہد مراد لیا ہے جو آپس میں ایک دوسرے سے کرتے تھے۔ اور یہ عہد شکنی، چاہے وہ کسی بھی قسم کی ہو، فسق ہی ہے۔

(۲) یہاں سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ذکر شروع ہو رہا ہے جو مذکورہ انبیا کے بعد آئے جو جلیل القدر پیغمبر تھے، جنہیں فرعون مصر اور اس کی قوم کی طرف دلائل و معجزات دے کر بھیجا گیا تھا۔

(۳) یعنی انہیں غرق کر دیا گیا، جیسا کہ آگے آئے گا۔

(۴) جو اس بات کی دلیل ہے کہ میں واقعی اللہ کی طرف سے مقرر کردہ رسول ہوں۔ اس معجزے اور بڑی دلیل کی تفصیل بھی آگے آرہی ہے۔

(۵) بنی اسرائیل، جن کا اصل مسکن شام کا علاقہ تھا، حضرت یوسف علیہ السلام کے زمانے میں مصر چلے گئے تھے اور پھر وہیں کے ہو کر رہ گئے۔ فرعون نے ان کو غلام بنا لیا تھا اور ان پر طرح طرح کے مظالم کرتا تھا، جس کی تفصیل پہلے سورہ بقرہ میں گزر چکی ہے اور آئندہ بھی آئے گی۔ فرعون اور اس کے درباری امرانے جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کی

فرعون نے کہا، اگر آپ کوئی معجزہ لے کر آئے ہیں تو اس کو اب پیش کیجئے! اگر آپ سچے ہیں۔ (۱۰۶)

پس آپ نے اپنا عصا ڈال دیا، سو دفعتاً وہ صاف ایک اژدھا بن گیا۔ (۱۰۷)

اور اپنا ہاتھ باہر نکالا سو وہ یکایک سب دیکھنے والوں کے روبرو بہت ہی چمکتا ہوا ہو گیا۔ (۱۰۸) ^(۱)

قوم فرعون میں جو سردار لوگ تھے انہوں نے کہا کہ واقعی یہ شخص بڑا ماہر جادوگر ہے۔ (۱۰۹) ^(۲)

یہ چاہتا ہے کہ تم کو تمہاری سرزمین سے باہر کر دے سو تم لوگ کیا مشورہ دیتے ہو۔ (۱۱۰)

انہوں نے کہا کہ آپ ان کو اور ان کے بھائی کو مہلت دیجئے اور شہروں میں ہر کاروں کو بھیج دیجئے۔ (۱۱۱) ^(۳)

کہ وہ سب ماہر جادوگروں کو آپ کے پاس لا کر حاضر کر دیں۔ (۱۱۲) ^(۳)

قَالَ إِنْ كُنْتَ جِئْتَ بِآيَةٍ فَإِنَّ يَهُودَ كُنْتُمْ مِنَ الصَّادِقِينَ ۝

قَالَ لَقَدْ عَلِمْتُمْ أَنِّي رَسُولُ اللَّهِ وَمَا كُنْتُمْ بِمُؤْمِنِينَ ۝

وَوَرَّعَ يَدَهُ إِذْ أَخَذَ مِنَ مِصْرَافٍ لِلْمُطِيرِينَ ۝

قَالَ الْمَلَأُ مِنْ قَوْمِ فِرْعَوْنَ إِنَّ هَذَا السَّحَرُ عَلَيْهِمْ ۝

يُرِيدُونَ أَن يُخْرِجُكُمْ مِنْ أَرْضِكُمْ فَأَيَّ آتَاءِ مُرُون ۝

قَالُوا آتِئْنَا وَآخَاهُ وَآزْوَاجَهُ فِي الْمَدَائِنِ خَيْرِينَ ۝

يَأْتُونَكَ بِكُلِّ سِحْرٍ عَلِيمٍ ۝

دعوت کو ٹھکرا دیا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون سے یہ دو سرا مطالبہ کیا کہ بنی اسرائیل کو آزاد کر دے تاکہ یہ اپنے آبائی مسکن میں جا کر عزت و احترام کی زندگی گزاریں اور اللہ کی عبادت کریں۔

(۱) یعنی اللہ تعالیٰ نے جو دو بڑے معجزے انہیں عطا فرمائے تھے، اپنی صداقت کے لیے انہیں پیش کر دیا۔

(۲) معجزے دیکھ کر ایمان لانے کے بجائے، فرعون کے درباریوں نے اسے جادو قرار دے کر یہ کہہ دیا کہ یہ تو بڑا ماہر جادوگر ہے جس سے اس کا مقصد تمہاری حکومت کو ختم کرنا ہے۔ کیونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں جادو کا بڑا زور اور اس کا عام چلن تھا، اس لیے انہوں نے معجزات کو بھی جادو سمجھا، جن میں سرے سے انسان کا دخل ہی نہیں ہوتا۔ خالص اللہ کی مشیت سے ظہور میں آتے ہیں۔ تاہم اس عنوان سے فرعون کے درباریوں کے لیے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں فرعون کو برکانے کا موقع مل گیا۔

(۳) حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں جادوگری کو بڑا عروج حاصل تھا۔ اسی لئے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پیش کردہ معجزات کو بھی انہوں نے جادو سمجھا اور جادو کے ذریعے سے اس کا توڑ مہیا کرنے کا منصوبہ بنایا۔ جس طرح دوسرے مقام پر فرمایا کہ فرعون اور اس کے درباریوں نے کہا ”اے موسیٰ علیہ السلام! کیا تو چاہتا ہے کہ اپنے جادو کے زور سے ہمیں ہماری زمین سے نکال دے؟“ پس ہم بھی اس جیسا جادو تیرے مقابلے میں لائیں گے، اس کے لیے کسی

اور وہ جادوگر فرعون کے پاس حاضر ہوئے، کہنے لگے کہ اگر ہم غالب آئے تو ہم کو کوئی بڑا صلہ ملے گا؟ (۱۱۳) فرعون نے کہا کہ ہاں اور تم مقرب لوگوں میں داخل ہو جاؤ گے۔^(۱) (۱۱۳)

ان ساحروں نے عرض کیا کہ اے موسیٰ! خواہ آپ ڈالنے اور یا ہم ہی ڈالیں؟^(۲) (۱۱۵)

(موسیٰ علیہ السلام) نے فرمایا کہ تم ہی ڈالو،^(۳) پس جب انہوں نے ڈالا تو لوگوں کی نظر بندی کردی اور ان پر ہیبت غالب کردی اور ایک طرح کا بڑا جادو دکھلایا۔^(۴) (۱۱۶)

وَجَاءَ السَّحَرَةُ فِرْعَوْنَ قَالُوا إِنَّ لَنَا لَأَجْرًا إِن كُنَّا نَمُنُّ
الْقُلُوبِ ۝۱۳

قَالَ نَعَمْ وَإِنَّكُمْ لَمِنَ الْمُقَرَّبِينَ ۝۱۴

قَالُوا لِمُوسَىٰ إِنَّمَا أَنْتَ مُنْفِقٌ وَلِمَ أَنْتَ تَكُونُ مَعِنَ الْمُنْفِقِينَ ۝۱۵

قَالَ لَقَوْلَاهُمْ لَمَّا أَلْقَوْا سَحَرُوا أَعْيُنَ النَّاسِ وَاسْتَرَبُّوهُمْ
وَجَاءُوا بِسِحْرٍ عَظِيمٍ ۝۱۶

ہموار جگہ اور وقت کا ہم تعین کر لیں جس کی دونوں پابندی کریں، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ نوروز کا دن اور چاشت کا وقت ہے، اس حساب سے لوگ جمع ہو جائیں۔“ (سورۃ طہ- ۵۷-۵۹)

(۱) جادوگر، چون کہ طالب دنیا تھے، دنیا کمانے کے لیے ہی شعبہ بازی کا فن سیکھتے تھے، اس لیے انہوں نے موقع غنیمت جانا کہ اس وقت تو بادشاہ کو ہماری ضرورت لاحق ہوئی ہے، کیوں نہ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر زیادہ سے زیادہ اجرت حاصل کی جائے۔ چنانچہ انہوں نے اپنا مطالبہ اجرت، کامیابی کی صورت میں پیش کر دیا، جس پر فرعون نے کہا کہ اجرت ہی نہیں بلکہ تم میرے مقربین میں بھی شامل ہو جاؤ گے۔

(۲) جادوگروں نے یہ اختیار اپنے آپ پر مکمل اعتماد کرنے کی وجہ سے دیا۔ انہیں پورا یقین تھا کہ ہمارے جادو کے مقابلے میں موسیٰ علیہ السلام کا معجزہ، جسے وہ ایک کرتب ہی سمجھتے تھے، کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ اور اگر موسیٰ علیہ السلام کو پہلے اپنے کرتب دکھانے کا موقع دے بھی دیا تو اس سے کوئی خاص فرق نہیں پڑے گا، ہم اس کے کرتب کا توڑ بہر صورت مہیا کر لیں گے۔

(۳) لیکن موسیٰ علیہ السلام چونکہ اللہ کے رسول تھے اور اللہ کی تائید انہیں حاصل تھی، اس لیے انہیں اپنے اللہ کی مدد کا یقین تھا، لہذا انہوں نے بغیر کسی خوف اور تامل کے جادوگروں سے کہا کہ پہلے تم جو دکھانا چاہتے ہو، دکھاؤ! علاوہ ازیں اس میں یہ حکمت بھی ہو سکتی ہے کہ جادوگروں کے پیش کردہ جادو کا توڑ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف سے معجزانہ انداز میں پیش ہو گا تو یہ لوگوں کے لیے زیادہ متاثر کن ہو گا، جس سے ان کی صداقت واضح تر ہوگی اور لوگوں کے لیے ایمان لانا سہل ہو جائے گا۔

(۴) بعض آثار میں بتایا گیا ہے کہ یہ جادوگر ۷۰ ہزار کی تعداد میں تھے۔ بظاہر یہ تعداد مبالغے سے خالی نہیں، جن میں سے ہر ایک نے ایک ایک رسی اور ایک ایک لائٹھی میدان میں پھینکی، جو دیکھنے والوں کو دوڑتی ہوئی محسوس ہوتی تھیں۔ یہ گویا بزم خولیش بہت بڑا جادو تھا جو انہوں نے پیش کیا۔

وَأَوْحَيْنَا إِلَىٰ مُوسَىٰ أَنْ أَلْقِ عَصَاكَ فَإِذَا هِيَ تَلْقَفُ
مَا يَأْتِيكَونَ ﴿۱۱۷﴾

فَوَقَعَ الْحَقُّ وَبَطَلَ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿۱۱۸﴾

فَغَلَبُوا هَانُتًا لِّكَ وَانْقَلَبُوا صٰغِرِينَ ﴿۱۱۹﴾

وَأَلْقَى السَّحَرَةُ سٰجِدِينَ ﴿۱۲۰﴾

قَالُوا الْمَثٰلُ بِرَبِّ الْعٰلَمِينَ ﴿۱۲۱﴾

رَبِّ مُوسَىٰ وَهٰرُونَ ﴿۱۲۲﴾

قَالَ فِرْعَوْنُ اٰمَنَّا بِرَبِّهِ قَبْلَ اَنْ اٰذَنَ لَكُمْ اِنَّ هٰذَا
لَمَكْرٌ مَّكْرَتُهُمْ وَاِنَّا لَفِي الْمَدِيْنَةِ لَمُخْرَجُوْنَ مِنْهَا اَهْلًا مَّسٰوِفٌ
تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۲۳﴾

اور ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) کو حکم دیا کہ اپنا عصا ڈال
دیجئے! سو عصا کا ڈالنا تھا کہ اس نے ان کے سارے بنے
بنائے کھیل کو ننگنا شروع کیا۔^(۱) (۱۱۷)

پس حق ظاہر ہو گیا اور انہوں نے جو کچھ بنایا تھا سب جاتا
رہا۔ (۱۱۸)

پس وہ لوگ اس موقع پر ہار گئے اور خوب ذلیل ہو کر
پھرے۔ (۱۱۹)

اور وہ جو ساحر تھے سجدہ میں گر گئے۔ (۱۲۰)

کہنے لگے کہ ہم ایمان لائے رب العالمین پر۔^(۲) (۱۲۱)

جو موسیٰ اور ہارون کا بھی رب ہے۔^(۳) (۱۲۲)

فرعون کہنے لگا کہ تم موسیٰ پر ایمان لائے ہو بغیر اس کے
کہ میں تم کو اجازت دوں؟ بے شک یہ سازش تھی جس
پر تمہارا عمل درآمد ہوا ہے اس شہر میں تاکہ تم سب اس
شہر سے یہاں کے رہنے والوں کو باہر نکال دو۔ سو اب تم
کو حقیقت معلوم ہوئی جاتی ہے۔^(۳) (۱۲۳)

(۱) لیکن یہ جو کچھ بھی تھا، ایک تخیل، شعبدہ بازی اور جادو تھا جو حقیقت کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا، چنانچہ موسیٰ علیہ السلام
کے لاشی ڈالتے ہی سب کچھ ختم ہو گیا اور لاشی نے ایک خوفناک اثر دھے کی شکل اختیار کر کے سب کچھ نکل لیا۔

(۲) جادو گروں نے جو جادو کے فن اور اس کی اصل حقیقت کو جانتے تھے، یہ دیکھا تو سمجھ گئے کہ موسیٰ علیہ السلام نے
جو کچھ یہاں پیش کیا ہے، جادو نہیں ہے، یہ واقعی اللہ کا نمائندہ ہے اور اللہ کی مدد سے ہی اس نے یہ معجزہ پیش کیا ہے۔
جس نے آن واحد میں ہم سب کے کرتبوں پر پانی پھیر دیا۔ چنانچہ انہوں نے موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لانے کا اعلان کر
دیا۔ اس سے یہ بات واضح ہوئی کہ باطل، باطل ہے چاہے اس پر کتنے ہی حسین غلاف چڑھالیے جائیں اور حق، حق ہے
چاہے اس پر کتنے ہی پردے ڈال دیئے جائیں، تاہم حق کا ڈنک بج کر رہتا ہے۔

(۳) سجدے میں گر کر انہوں نے رب العالمین پر ایمان لانے کا اعلان کیا جس سے فرعونوں کو مغالطہ ہو سکتا تھا کہ یہ
سجدہ فرعون کو کیا گیا ہے جس کی الوہیت کے وہ قائل تھے، اس لئے انہوں نے موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام کا
رب کہہ کر واضح کر دیا کہ یہ سجدہ ہم جنانوں کے رب کو ہی کر رہے ہیں۔ لوگوں کے خود ساختہ کسی رب کو نہیں۔

(۴) یہ جو کچھ ہوا، فرعون کے لیے بڑا حیران کن اور تعجب خیز تھا، اس لیے اسے اور تو کچھ نہیں سوچا، اس نے یہی کہہ

میں تمہارے ایک طرف کے ہاتھ اور دوسری طرف کے پاؤں کاٹوں گا۔ پھر تم سب کو سولی پر لٹکا دوں گا۔^(۱) (۱۳۳)
انہوں نے جواب دیا کہ ہم (مرکز) اپنے مالک ہی کے پاس جائیں گے۔^(۲) (۱۳۵)

اور تو نے ہم میں کونسا عیب دیکھا ہے۔ بجز اس کے کہ ہم اپنے رب کے احکام پر ایمان لے آئے،^(۳) جب وہ ہمارے پاس آئے۔ اے ہمارے رب! ہمارے اوپر صبر کا فیضان فرما^(۴) اور ہماری جان حالت اسلام پر نکال۔^(۵) (۱۳۶)

اور قوم فرعون کے سرداروں نے کہا کہ کیا آپ موسیٰ (علیہ السلام) اور ان کی قوم کو یوں ہی رہنے دیں گے کہ وہ ملک میں فساد کرتے پھریں،^(۶) اور وہ آپ کو اور آپ

لَا قِطْعَانَ أَيْدِيكُمْ وَأَرْجُلِكُمْ مِمَّنْ خِلَافِ ثُمَّ لَا ضَلِيلَ لَكُمْ أَجْمَعِينَ ۝

قَالُوا إِنَّا إِلَىٰ رَبِّنَا مُنْقَلِبُونَ ۝

وَمَا تَنْقُمُ مِنَّا إِلَّا أَنْ أَمَّنَّا بِإِلَهِ رَبِّنَا لَمَّا جَاءَنَا رَبَّنَا
أَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَتَوَقَّنَا مُسْلِمِينَ ۝

وَقَالَ الْمَلَأُ مِن قَوْمِ فِرْعَوْنَ أَتَدْرُمُونِى وَقَوْمِى
يُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ وَيَذَرُونَ الْهَتَكَ قَالَ سَنَقَاتِلُ

دیا کہ تم سب آپس میں ملے ہوئے ہو اور اس کا مقصد ہمارے اقتدار کا خاتمہ ہے۔ اچھا! اس کا انجام عنقریب تمہیں معلوم ہو جائے گا۔

(۱) یعنی دایاں پاؤں اور بائیاں ہاتھ یا بائیاں پاؤں اور دایاں ہاتھ، پھر یہی نہیں، سولی پر چڑھا کر تمہیں نشان عبرت بھی بنا دوں گا۔
(۲) اس کا ایک مفہوم تو یہ ہے کہ اگر تو ہمارے ساتھ ایسا معاملہ کرے گا تو تجھے بھی اس بات کے لیے تیار رہنا چاہیے کہ قیامت والے دن اللہ تعالیٰ تجھے اس جرم کی سخت سزا دے گا، اس لیے کہ ہم سب کو مرکز اسی کے پاس جانا ہے، اس کی سزا سے کون بچ سکتا ہے؟ گویا فرعون کے عذاب دنیا کے مقابلے میں اسے عذاب آخرت سے ڈرایا گیا ہے۔ دوسرا مفہوم یہ ہے کہ موت تو ہمیں آنی ہی آتی ہے، اس سے کیا فرق پڑے گا کہ موت سولی پر آئے یا کسی اور طریقے سے؟
(۳) یعنی تیرے نزدیک ہمارا یہی عیب ہے۔ جس پر تو ہم سے ناراض ہو گیا ہے اور ہمیں سزا دینے پر تل گیا ہے۔ دراصل حالیکہ یہ سرے سے عیب ہی نہیں ہے۔ یہ تو خوبی ہے، بہت بڑی خوبی، کہ جب حقیقت ہمارے سامنے واضح ہو کر آگئی تو ہم نے اس کے مقابلے میں تمام دنیاوی مفادات ٹھکرا دیئے اور حقیقت کو اپنا لیا۔ پھر انہوں نے اپنا روئے سخن فرعون سے پھیر کر اللہ کی طرف کر لیا اور اس کی بارگاہ میں دست بدعا ہو گئے۔

(۴) تاکہ ہم تیرے اس دشمن کے عذاب کو برداشت کر لیں، اور حق میں متعصب اور ایمان پر ثابت قدم رہیں۔

(۵) اس دنیاوی آزمائش سے ہمارے اندر ایمان سے انحراف آئے نہ کسی اور فتنے میں ہم مبتلا ہوں۔

(۶) یہ ہر دور کے مفسدین کا شیوہ رہا ہے کہ وہ اللہ والوں کو فسادى اور ان کی دعوت ایمان و توحید کو فساد سے تعبیر کرتے ہیں۔ فرعونوں نے بھی یہی کہا۔

کے معبودوں کو ترک کئے رہیں۔^(۱) فرعون نے کہا کہ ہم ابھی ان لوگوں کے بیٹوں کو قتل کرنا شروع کر دیں گے اور عورتوں کو زندہ رہنے دیں گے اور ہم کو ان پر ہر طرح کا زور ہے۔^(۲) (۱۲۷)

موسیٰ (علیہ السلام) نے اپنی قوم سے فرمایا اللہ تعالیٰ کا سہارا حاصل کرو اور صبر کرو، یہ زمین اللہ تعالیٰ کی ہے، اپنے بندوں میں سے جس کو چاہے وہ مالک بنا دے اور اخیر کامیابی ان ہی کی ہوتی ہے جو اللہ سے ڈرتے ہیں۔^(۳) (۱۲۸)

قوم کے لوگ کہنے لگے کہ ہم تو ہمیشہ مصیبت ہی میں رہے، آپ کی تشریف آوری سے قبل بھی^(۴) اور آپ کی تشریف آوری کے بعد بھی۔^(۵) موسیٰ (علیہ السلام) نے فرمایا کہ بہت جلد اللہ تمہارے دشمن کو ہلاک کر دے گا اور بجائے ان کے تم کو اس سرزمین کا خلیفہ بنا

أَبْنَاءَهُمْ وَنَسْتَحْيِي نِسَاءَهُمْ وَإِنَّا فَوْقَهُمْ قَاهِرُونَ ﴿۱۲۷﴾

قَالَ مُوسَىٰ لِقَوْمِهِ اسْتَعِينُوا بِاللَّهِ وَاصْبِرُوا إِنَّ الْأَرْضَ لِلَّهِ يُورِثُهَا مَنْ يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ ۗ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِينَ ﴿۱۲۸﴾

قَالُوا أَوَآؤذِينَا مِنْ قَبْلِ أَنْ تَأْتِيَنَا وَمِنْ بَعْدِ مَا جِئْتَنَا ۚ قَالَ عَلَىٰ رَبِّكُمْ أَنْ يُهْلِكَ عَدُوُّكُمْ وَيَسْتَخْلِفَكُمْ فِي الْأَرْضِ فَيَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُونَ ﴿۱۲۹﴾

(۱) فرعون کو بھی اگرچہ دعوائے ربوبیت تھا ﴿ إِنَّا رَبُّكَ الْأَعْلَىٰ ﴾ میں تمہارا بڑا رب ہوں“ (وہ کہا کرتا تھا) لیکن دوسرے چھوٹے چھوٹے معبود بھی تھے جن کے ذریعے سے لوگ فرعون کا تقرب حاصل کرتے تھے۔

(۲) ہمارے اس انتظام میں یہ رکاوٹ نہیں ڈال سکتے۔ قتلِ ابناء کا یہ پروگرام فرعونوں کے کہنے سے بنایا گیا اس سے قبل بھی، جب موسیٰ علیہ السلام کی ولادت نہیں ہوئی تھی، موسیٰ علیہ السلام کے بعد از ولادت خاتمے کے لیے اس نے بنی اسرائیل کے نومولود بچوں کو قتل کرنا شروع کیا تھا، اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کی ولادت کے بعد ان کو بچانے کی یہ تدبیر کی کہ موسیٰ علیہ السلام کو خود فرعون کے محل میں پہنچوا کر اسی کی گود میں ان کی پرورش کروائی۔ فَلِلَّهِ الْمَكْرُ جَمِيعًا.

(۳) جب فرعون کی طرف سے دوبارہ اس ظلم کا آغاز ہوا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کو اللہ سے مدد حاصل کرنے اور صبر کرنے کی تلقین کی اور تسلی دی کہ اگر تم صحیح رہے تو زمین کا اقتدار بالآخر تمہیں ہی ملے گا۔

(۴) یہ اشارہ ہے ان مظالم کی طرف جو ولادت موسیٰ علیہ السلام سے قبل ان پر ہوتے رہے۔

(۵) جاوید گروں کے واقعے کے بعد ظلم و ستم کا یہ نیا دور ہے، جو موسیٰ علیہ السلام کے آنے کے بعد شروع ہوا۔

دے گا پھر تمہارا طرز عمل دیکھے گا۔^(۱) (۱۲۹)
 اور ہم نے فرعون والوں کو مبتلا کیا قحط سالی میں اور پھلوں کی
 کم پیداواری میں، تاکہ وہ نصیحت قبول کریں۔^(۲) (۱۳۰)
 سو جب ان پر خوشحالی آجاتی تو کہتے کہ یہ تو ہمارے لئے ہونا
 ہی چاہیے اور اگر ان کو کوئی بد حالی پیش آتی تو موسیٰ (علیہ
 السلام) اور ان کے ساتھیوں کی نحوست بتلاتے۔^(۳) یاد
 رکھو کہ ان کی نحوست اللہ تعالیٰ کے پاس ہے،^(۴) لیکن ان
 کے اکثر لوگ نہیں جانتے۔ (۱۳۱)
 اور یوں کہتے کیسی ہی بات ہمارے سامنے لاؤ کہ ان کے
 ذریعہ سے ہم پر جادو چلاؤ جب بھی ہم تمہاری بات ہرگز
 نہ مانیں گے۔^(۵) (۱۳۲)

وَلَقَدْ أَخَذْنَا آلَ فِرْعَوْنَ بِالسِّنِينَ وَنَقِصٍ مِنَ
 الثَّمَرَاتِ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُونَ ﴿۱۲۹﴾
 فَإِذَا جَاءَتْهُمْ الْحَسَنَةُ قَالُوا لَئِنَّا هِذِهِ وَإِنْ تُصِبُّهُمْ سَيِّئَةٌ
 يَطَّيَّرُوا بِمُوسَىٰ وَمَنْ مَعَهُ أَلَا لَأَمَّا ظَلَمُوا عِنْدَ اللَّهِ
 وَلَكِنَّ الْكُفْرَ هُمْ لَا يَعْلَمُونَ ﴿۱۳۰﴾
 وَقَالُوا مَهْمَا تَأْتِنَا بِهِ مِنْ آيَةٍ لِنَسْحَرَنَّ بِهَا فَمَا نَحْنُ
 لَكَ يٰمُؤْمِنِينَ ﴿۱۳۱﴾

(۱) حضرت موسیٰ علیہ السلام نے تسلی دی کہ گھبراؤ نہیں، بہت جلد اللہ تمہارے دشمن کو ہلاک کر کے زمین میں تمہیں
 اقتدار عطا فرمائے گا۔ اور پھر تمہاری آزمائش کا ایک نیا دور شروع ہو گا۔ ابھی تو تکلیفوں کے ذریعے سے آزمائے جا رہے
 ہو، پھر انعام و اکرام کی بارش کر کے اور اختیار و اقتدار سے بہرہ مند کر کے تمہیں آزمایا جائے گا۔
 (۲) آلَ فِرْعَوْنَ سے مراد فرعون کی قوم ہے۔ اور سِنِينَ سے قحط سالی۔ یعنی بارش کے فقدان اور درختوں میں کیڑے وغیرہ
 لگ جانے سے پیداوار میں کمی۔ مقصد اس آزمائش سے یہ تھا کہ اس ظلم اور استکبار سے باز آجائیں جس میں وہ مبتلا تھے۔
 (۳) حَسَنَةٌ (بھلائی) سے مراد غلے اور پھلوں کی فراوانی اور سَيِّئَةٌ (برائی) سے اس کے برعکس اور قحط سالی اور پیداوار
 میں کمی۔ حَسَنَةٌ کا سارا کریڈٹ خود لے لیتے کہ یہ ہماری محنت کا ثمرہ ہے اور بد حالی کا سبب حضرت موسیٰ علیہ السلام اور
 ان پر ایمان لانے والوں کو قرار دیتے کہ یہ تم لوگوں کی نحوست کے اثرات ہمارے ملک پر پڑ رہے ہیں۔
 (۴) طَّيَّرُوا کے معنی ہیں ”اڑنے والا“ یعنی پرندہ۔ چون کہ پرندے کے بائیں یا دائیں اڑنے سے وہ لوگ نیک فالی یا بد فالی لیا
 کرتے تھے۔ اس لیے یہ لفظ مطلق فال کے لیے بھی استعمال ہونے لگ گیا اور یہاں یہ اسی معنی میں استعمال ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ
 نے فرمایا کہ خیر یا شر جو خوش حالی یا قحط سالی کی وجہ سے انہیں پہنچتا ہے، اس کے اسباب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہیں، موسیٰ علیہ
 السلام اور ان کے پیروکار اس کا سبب نہیں۔ ﴿ظَلَمُوا عِنْدَ اللَّهِ﴾ کا مطلب ہو گا کہ ان کی بد شگونیاں کا سبب اللہ کے علم میں ہے
 اور وہ ان کا کفر و انکار ہے نہ کہ کچھ اور۔ یا اللہ کی طرف سے ہے اور اس کی وجہ ان کا کفر ہے۔
 (۵) یہ اسی کفر و مجود کا نظارہ ہے جس میں وہ مبتلا تھے، اور معجزات و آیات الہی کو اب بھی وہ جادوگری باور کرتے یا کراتے تھے۔

پھر ہم نے ان پر طوفان بھیجا اور ٹڈیاں اور گھن کا کیرا اور مینڈک اور خون، کہ یہ سب کھلے کھلے معجزے تھے۔^(۱) سو وہ تکبر کرتے رہے اور وہ لوگ کچھ تھے ہی جرائم پیشہ۔ (۱۳۳)

اور جب ان پر کوئی عذاب واقع ہوتا تو یوں کہتے کہ اے موسیٰ! ہمارے لئے اپنے رب سے اس بات کی دعا کر دیجئے! جس کا اس نے آپ سے عہد کر رکھا ہے، اگر آپ اس عذاب کو ہم سے ہٹادیں تو ہم ضرور ضرور آپ کے کہنے سے ایمان لے آئیں گے اور ہم بنی اسرائیل کو بھی (رہا کر کے) آپ کے ہمراہ کر دیں گے۔ (۱۳۴)

پھر جب ان سے اس عذاب کو ایک خاص وقت تک کہ اس تک ان کو پہنچنا تھا ہٹا دیتے، تو وہ فوراً ہی عہد شکنی کرنے لگتے۔^(۲) (۱۳۵)

فَأَرْسَلْنَا عَلَيْهِمُ الطُّوفَانَ وَالْجُرَادَ وَالْقُمَّلَ وَالضَّفَادِعَ
وَالدَّمَ آيَاتٍ مُّفَصَّلَاتٍ فَأَسْتَكْبَرُوا وَكَانُوا
قَوْمًا مُّجْرِمِينَ ۝

وَلَمَّا وَقَعَ عَلَيْهِمُ الرِّجْزُ قَالُوا لِمُوسَى اذْعُرْنَا رَبِّكَ بِمَا
عٰهَدَ عِنْدَكَ لَئِن كَشَفْتَ عَنَّا الرِّجْزَ لَنُؤْمِنَنَّ لَكَ
وَلَنُرْسِلَنَّ مَعَكَ بَنِي إِسْرَائِيلَ ۝

فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُمُ الرِّجْزَ إِلَىٰ أَجَلٍ هُمْ بَلِغُوهُ إِذَا
هُم يَنْكُرُونَ ۝

(۱) طوفان سے سیلاب یا کثرت بارش، جس سے ہر چیز غرق ہو گئی، یا کثرت اموات مراد ہے، جس سے ہر گھر میں ماتم برپا ہو گیا۔ جَرَادٌ ٹڈی کو کہتے ہیں، ٹڈی دل کا حملہ فصلوں کی ویرانی کے لیے مشہور ہے۔ یہ ٹڈیاں ان کے غلوں اور پھلوں کی فصلوں کو کھا کر چٹ کر جاتیں۔ قُمَّلٌ سے مراد جوں ہیں جو انسان کے جسم، کپڑے اور بالوں میں ہو جاتی ہیں یا گھن کا کیرا ہے جو غلے میں لگ جاتا ہے تو اس کے بیشتر حصے کو ختم کر دیتا ہے۔ جوؤں سے انسان کو گھن بھی آتی ہے اور اس کی کثرت سے سخت پریشانی بھی۔ اور جب یہ بطور عذاب ہوں تو اس سے لاحق ہونے والی پریشانی کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ اسی طرح گھن کا عذاب بھی معیشت کو کھوکھا کر دینے کے لیے کافی ہے۔ ضَفَادِعُ، ضَفَدَعَةٌ کی جمع ہے یہ مینڈک کو کہتے ہیں جو پانی اور جوہڑوں، چھپڑوں میں ہوتا ہے۔ یہ مینڈک ان کے کھانوں میں، بستروں میں، ابلے ہوئے غلوں میں غرض ہر جگہ اور ہر طرف مینڈک ہی مینڈک ہو گئے، جس سے ان کا کھانا پینا، سونا اور آرام کرنا حرام ہو گیا۔ دَمٌ (خون) سے مراد ہے پانی کا خون بن جانا، یوں پانی پینا ان کے لیے ناممکن ہو گیا۔ بعض نے خون سے مراد نکسیر کی بیماری لی ہے۔ یعنی ہر شخص کی ناک سے خون جاری ہو گیا آیاتٌ مُّفَصَّلَاتٌ یہ کھلے کھلے اور جدا جدا معجزے تھے، جو وقفے وقفے سے ان کے پاس آئے۔

(۲) یعنی ایک عذاب آتا تو اس سے تنگ آ کر موسیٰ علیہ السلام کے پاس آتے، ان کی دعا سے وہ ٹل جاتا تو ایمان لانے کے بجائے، پھر اس کفر و شرک پر جسے رہتے۔ پھر دو سرا عذاب آ جاتا تو پھر اسی طرح کرتے۔ یوں کچھ کچھ وقفوں سے پانچ عذاب ان پر آئے۔ لیکن ان کے دلوں میں جو رعونت اور دماغوں میں جو تکبر تھا، وہ حق کی راہ میں ان کے لیے زنجیر پائنا رہا اور اتنی اتنی واضح نشانیاں دیکھنے کے باوجود وہ ایمان کی دولت سے محروم ہی رہے۔

پھر ہم نے ان سے بدلہ لیا یعنی ان کو دریا میں غرق کر دیا اس سبب سے کہ وہ ہماری آیتوں کو جھٹلاتے تھے اور ان سے بالکل ہی غفلت کرتے تھے۔^(۱) (۱۳۶)

اور ہم نے ان لوگوں کو جو کہ بالکل کمزور شمار کئے جاتے تھے۔^(۲) اس سرزمین کے پورے پچھم کمالک بنا دیا، جس میں ہم نے برکت رکھی ہے^(۳) اور آپ کے رب کانیک وعدہ بنی اسرائیل کے حق میں ان کے صبر کی وجہ سے پورا ہو گیا^(۴) اور ہم نے فرعون کے اور اس کی قوم کے ساتھ پرداختہ کارخانوں کو اور جو کچھ وہ اونچی اونچی عمارتیں

فَأَنْتَقَمْنَا مِنْهُمْ فَأَغْرَقْنَاهُمْ فِي الْيَمِّ يَأْتُهُمُ كَذِبًا
يَأْتِينَا وَكَانُوا عَنْهَا غَافِلِينَ ﴿۱۳۶﴾

وَأَوْرَثْنَا الْقَوْمَ الَّذِينَ كَانُوا يُسْتَضَعُونَ مَشَارِقَ
الْأَرْضِ وَمَغَارِبَهَا الَّتِي بَركْنَا فِيهَا وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ
الْحُسْنَىٰ عَلَىٰ بَنِي إِسْرَائِيلَ ۚ بِمَا صَبَرُوا وَدَمَرْنَا
مَا كَانُوا يُصْنَعُونَ فِرْعَوْنَ وَقَوْمَهُ وَمَا كَانُوا يَعْرِشُونَ ﴿۱۳۷﴾

(۱) اتنی بڑی بڑی نشانیوں کے باوجود وہ ایمان لانے کے لیے اور خواب غفلت سے بیدار ہونے کے لیے تیار نہیں ہوئے۔ بالآخر انہیں دریا میں غرق کر دیا گیا، جس کی تفصیل قرآن مجید کے مختلف مقامات پر موجود ہے۔

(۲) یعنی بنی اسرائیل کو، جن کو فرعون نے غلام بنا رکھا تھا اور ان پر ظلم روا رکھتا تھا۔ اس بنا پر وہ فی الواقع مصر میں کمزور سمجھے جاتے تھے کیونکہ مغلوب اور غلام تھے۔ لیکن جب اللہ نے چاہا تو اسی مغلوب اور غلام قوم کو زمین کا وارث بنا دیا۔

﴿ وَنَحْنُ مَنْ نَسَاءُ وَتَذِلُّ مَنْ تَسَاءُ ﴾ (آل عمران-۲۶)

(۳) زمین سے مراد شام کا علاقہ فلسطین ہے، جہاں اللہ تعالیٰ نے عمالقہ کے بعد بنی اسرائیل کو غلبہ عطا فرمایا، شام میں بنی اسرائیل حضرت موسیٰ علیہ السلام و ہارون علیہ السلام کی وفات کے بعد اس وقت گئے جب حضرت یوشع بن نون نے عمالقہ کو شکست دے کر بنی اسرائیل کے لیے راستہ ہموار کر دیا۔ اور زمین کے ان حصوں میں برکتیں رکھیں، یعنی شام کے علاقے میں۔ جو بکثرت انبیاء کا مسکن و مدفن رہا اور ظاہری شادابی و خوش حالی میں بھی ممتاز ہے۔ یعنی ظاہری و باطنی دونوں قسم کی برکتوں سے یہ زمین مالا مال رہی ہے۔ مشارق مشرق کی جمع اور مغارب مغرب کی جمع ہے۔ حالانکہ مشرق اور مغرب ایک ایک ہی ہیں۔ جمع سے مراد اس ارض بابرکت کے مشرقی اور مغربی حصے ہیں یعنی جمات مشرق و مغرب۔

(۴) یہ وعدہ یہی ہے جو اس سے قبل حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زبانی آیت ۱۲۸ و ۱۲۹ میں فرمایا گیا ہے اور سورہ قصص میں بھی۔ ﴿ وَنُرِيدُ أَنْ نَمُنَّ عَلَى الَّذِينَ اسْتَضَعُوا فِي الْأَرْضِ وَنَجْعَلَهُمْ أَئِمَّةً وَنَجْعَلَهُمُ الْوَارِثِينَ * وَنُكِّنْ لَهُمْ فِي الْأَرْضِ وَنُرِي فِرْعَوْنَ وَهَامَانَ وَجُودَهُمَا مِنْهُم مَّا كَانُوا يَعْتَدُونَ ﴾ (القصص ۲۵) ”ہم چاہتے ہیں کہ ان پر احسان کریں جو زمین میں کمزور سمجھے جاتے ہیں اور ان کو پیشوا بنائیں اور ملک کا وارث کریں اور ملک میں ان کو قوت و طاقت دیں اور فرعون و ہامان اور ان کے لشکروں کو وہ چیز دکھادیں جس سے وہ ڈرتے ہیں“ اور یہ فضل و احسان اس صبر کی وجہ سے ہوا جس کا مظاہرہ انہوں نے فرعون کی مظالم کے مقابلے میں کیا۔

بنواتے تھے، سب کو درہم برہم کر دیا۔^(۱) (۱۳۷)

اور ہم نے بنی اسرائیل کو دریا سے پار اتار دیا۔ پس ان لوگوں کا ایک قوم پر گزر ہوا جو اپنے چند بتوں سے لگے بیٹھے تھے، کہنے لگے اے موسیٰ! ہمارے لئے بھی ایک معبود ایسا ہی مقرر کر دیجئے! جیسے ان کے یہ معبود ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ واقعی تم لوگوں میں بڑی جمالت ہے۔^(۲) (۱۳۸)

یہ لوگ جس کام میں لگے ہیں یہ تباہ کیا جائے گا اور ان کا یہ کام محض بے بنیاد ہے۔^(۳) (۱۳۹)

فرمایا کیا اللہ تعالیٰ کے سوا اور کسی کو تمہارا معبود تجویز کر دوں؟ حالانکہ اس نے تم کو تمام جہان والوں پر فوقیت دی ہے۔^(۴) (۱۴۰)

اور وہ وقت یاد کرو جب ہم نے تم کو فرعون والوں سے بچالیا جو تم کو بڑی سخت تکلیفیں پہنچاتے تھے۔ تمہارے بیٹوں کو قتل کر ڈالتے تھے اور تمہاری عورتوں کو زندہ

وَجَوْرًا بَنِي إِسْرَائِيلَ الْبَحْرَ فَأَتَوْا عَلٰی قَوْمٍ يَعْلَمُونَ
عَلٰی أَصْنَآءٍ لَهُمْ ۚ قَالُوا لَيْسَ لَنَا إِلٰهٌ كَمَا لَهُمْ
الِهَةٌ ۚ قَالَ إِنَّكُمْ قَوْمٌ مَّجْمُونُونَ ﴿۱۳۷﴾

إِنَّ هَٰؤُلَاءِ مُتَّبِعُونَ مَا هُم بِفِيهِ وَيَطِلُوا مٰمًا كَانُوا
يَعْمَلُونَ ﴿۱۳۸﴾

قَالَ أَعْبُدُوا اللّٰهَ أَبْنِيَكُمْ إِلٰهًا وَهُوَ فَضَّلَكُمْ عَلٰی
الْعٰلَمِينَ ﴿۱۳۹﴾

وَإِذْ أَنْجَيْنَاكُمْ مِنْ آلِ فِرْعَوْنَ يَسُومُونَكُمْ سُوءَ الْعَذَابِ
يَقْتُلُونَ أَبْنَاءَكُمْ وَيَسْتَحْيُونَ نِسَاءَكُمْ وَفِي ذٰلِكُمْ
بَلَاءٌ مِّنْ رَبِّكُمْ عَظِيمٌ ﴿۱۴۰﴾

(۱) مصنوعات سے مراد کارخانے، عمارتیں اور ہتھیار وغیرہ ہیں اور یَعْرِشُونَ (جو وہ بلند کرتے تھے) سے مراد اونچی اونچی عمارتیں بھی ہو سکتی ہیں اور انگوروں وغیرہ کے باغات بھی جو وہ چھپروں پر پھیلاتے تھے۔ مطلب یہ ہے کہ ان کی شہری عمارتیں، ہتھیار اور دیگر سامان بھی تباہ کر دیا اور ان کے باغات بھی۔

(۲) اس سے بڑی جمالت اور نادانی کیا ہوگی کہ جس اللہ نے انہیں فرعون جیسے بڑے دشمن سے نہ صرف نجات دی، بلکہ ان کی آنکھوں کے سامنے اسے اس کے لشکر سمیت غرق کر دیا اور انہیں معجزانہ طریق سے دریا عبور کروایا۔ وہ دریا پار کرتے ہی اس اللہ کو بھول کر پتھر کے خود تراشیدہ معبود تلاش کرنے لگ گئے۔ کہتے ہیں کہ یہ بت گائے کی شکل کے تھے جو پتھر کی بنی ہوئی تھیں۔

(۳) یعنی یہ مورتیوں کے پجاری جن کے حال نے تمہیں بھی دھوکے میں ڈال دیا، ان کا مقدر تباہی اور ان کا یہ فعل باطل اور خسارے کا باعث ہے۔

(۴) کیا جس اللہ نے تم پر اتنے احسانات کیے اور تمہیں جانوں پر فضیلت بھی عطا کی، اسے چھوڑ کر میں تمہارے لیے پتھر اور لکڑی کے تراشے ہوئے بت تلاش کروں؟ یعنی یہ ناشکری اور احسان ناشناسی میں کس طرح کر سکتا ہوں؟ اگلی آیات میں اللہ تعالیٰ کے مزید احسانات کا تذکرہ ہے۔

چھوڑ دیتے تھے اور اس میں تمہارے پروردگار کی طرف سے بڑی بھاری آزمائش تھی۔^(۱) (۱۳۱)

اور ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) سے تیس راتوں کا وعدہ کیا اور دس رات مزید سے ان تیس راتوں کو پورا کیا۔ سو ان کے پروردگار کا وقت پورے چالیس رات کا ہو گیا۔^(۲) اور موسیٰ (علیہ السلام) نے اپنے بھائی ہارون (علیہ السلام) سے کہا کہ میرے بعد ان کا انتظام رکھنا اور اصلاح کرتے رہنا اور بد نظم لوگوں کی رائے پر عمل مت کرنا۔^(۳) (۱۳۲)

اور جب موسیٰ (علیہ السلام) ہمارے وقت پر آئے اور ان کے رب نے ان سے باتیں کیں تو عرض کیا کہ اے میرے پروردگار! اپنا دیدار مجھ کو کرا دیجئے کہ میں آپ کو ایک نظر دیکھ لوں ارشاد ہوا کہ تم مجھ کو ہرگز نہیں دیکھ سکتے^(۴) لیکن تم اس پہاڑ کی طرف دیکھتے رہو وہ اگر اپنی جگہ پر برقرار رہا تو تم بھی مجھے دیکھ سکو

وَوَعَدْنَا مُوسَىٰ ثَلَاثِينَ لَيْلَةً وَأَتَمَمْنَاهَا بِعَشْرِ فَتَمَّمَ مِيقَاتَ رَبِّهِ أَرْبَعِينَ لَيْلَةً وَقَالَ مُوسَىٰ لِأَخِيهِ هَرُونَ اخْلُفْنِي فِي قَوْمِي وَأَصْلِحْ وَلَا تَتَّبِعْ سَبِيلَ الْمُفْسِدِينَ ﴿۱۳۱﴾

وَلَمَّا جَاءَ مُوسَىٰ لِمِيقَاتِنَا وَكَلَّمَهُ رَبُّهُ قَالَ رَبِّ أَرِنِي أَنْظُرْ إِلَيْكَ قَالَ لَنْ نَرِيكَ وَلَكِنْ نُنظُرُ إِلَى الْجَبَلِ فَإِنِ اسْتَقَرَّ مَكَانَهُ فَسَوْفَ تَرَاهُ فَلَئِمَّا تَجَلَّىٰ رَبُّهُ لِلْجَبَلِ جَعَلَهُ دَكًّا وَخَرَّ مُوسَىٰ سُوقًا فَلَمَّا آفَقَ قَالَ سُبْحَانَكَ بُدِئْتُ إِلَيْكَ وَأَنَا أَوَّلُ الْمُؤْمِنِينَ ﴿۱۳۲﴾

(۱) یہ وہی آزمائشیں ہیں جن کا ذکر سورہ بقرہ میں بھی گزرا اور سورہ ابراہیم میں بھی آئے گا۔

(۲) فرعون اور اس کے لشکر کے غرق کے بعد ضرورت لاحق ہوئی کہ بنی اسرائیل کی ہدایت و رہنمائی کے لیے کوئی کتاب انہیں دی جائے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو تیس راتوں کے لیے کوہ طور پر بلایا، جس میں دس راتوں کا اضافہ کر کے اسے چالیس کر دیا گیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جاتے وقت حضرت ہارون علیہ السلام کو جو ان کے بھائی بھی تھے اور نبی بھی، اپنا جانشین مقرر کر دیا تاکہ وہ بنی اسرائیل کی ہدایت و اصلاح کا کام کرتے رہیں اور انہیں ہر قسم کے فساد سے بچائیں۔ اس آیت میں یہی بیان کیا گیا ہے۔

(۳) حضرت ہارون علیہ السلام خود نبی تھے اور اصلاح کا کام ان کے فرائض منصبی میں شامل تھا، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے انہیں محض تذکیر و تنبیہ کے طور پر یہ نصیحتیں کیں، میقات سے یہاں مراد وقت معین ہے۔

(۴) جب موسیٰ علیہ السلام طور پر گئے اور وہاں اللہ نے ان سے براہ راست گفتگو کی، تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دل میں اللہ کو دیکھنے کا بھی شوق پیدا ہوا، اور اپنے اس شوق کا اظہار رَبِّ أَرِنِي کہہ کر کیا۔ جس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ لَنْ تَرَانِي ”تو مجھے ہرگز نہیں دیکھ سکتا“ اس سے استدلال کرتے ہوئے معتزلہ نے کہا کہ لَنْ نَفِي تَأْبِيد (ہمیشہ کی نفی) کے لیے آتا ہے۔ اس لیے اللہ کا دیدار نہ دنیا میں ممکن ہے نہ آخرت میں۔ لیکن معتزلہ کا یہ مسلک صحیح احادیث

گے۔ پس جب ان کے رب نے پہاڑ پر تجلی فرمائی تو تجلی نے اس کے پر نچے اڑا دیئے اور موسیٰ (علیہ السلام) بے ہوش ہو کر گر پڑے۔^(۱) پھر جب ہوش میں آئے تو عرض کیا 'بے شک آپ کی ذات منزہ ہے میں آپ کی جناب میں توبہ کرتا ہوں اور میں سب سے پہلے آپ پر ایمان لانے والا ہوں۔'^(۲) (۱۳۳)

ارشاد ہوا کہ اے موسیٰ! میں نے پیغمبری اور اپنی ہمکلامی سے اور لوگوں پر تم کو امتیاز دیا ہے تو جو کچھ تم کو میں نے عطا کیا ہے اس کو لو اور شکر کرو۔^(۳) (۱۳۴)

اور ہم نے چند تختیوں پر ہر قسم کی نصیحت اور ہر چیز کی تفصیل ان کو لکھ کر دی،^(۴) تم ان کو پوری طاقت سے

قَالَ يُمُوسَىٰ إِنِّي اصْطَفَيْتُكَ عَلَى النَّاسِ بِرِسَالَتِي وَ
بِكَلَامِي ۖ فَخُذْ مَا آتَيْتُكَ وَكُن مِنَ الشَّاكِرِينَ ﴿۱۳۳﴾

وَكَتَبْنَا لَهُ فِي الْأَنْوَارِ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ مَوْعِظَةً وَتَفْصِيلًا
لِكُلِّ شَيْءٍ ۖ فَخُذْهَا بِقُوَّةٍ وَأْمُرْ قَوْمَكَ يَأْخُذُوا

کے خلاف ہے۔ متواتر، صحیح اور قوی روایات سے ثابت ہے کہ قیامت والے دن اہل ایمان اللہ کو دیکھیں گے اور جنت میں بھی دیدار الہی سے مشرف ہوں گے۔ تمام اہل سنت کا یہی عقیدہ ہے۔ اس نفی رویت کا تعلق صرف دنیا سے ہے۔ دنیا میں کوئی انسانی آنکھ اللہ کو دیکھنے پر قادر نہیں ہے۔ لیکن آخرت میں اللہ تعالیٰ ان آنکھوں میں اتنی قوت پیدا فرمادے گا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے جلوے کو برداشت کر سکے۔

(۱) یعنی وہ پہاڑ بھی رب کی تجلی کو برداشت نہ کر سکا اور موسیٰ علیہ السلام بے ہوش ہو کر گر پڑے۔ حدیث میں آتا ہے کہ "قیامت والے دن سب لوگ بے ہوش ہوں گے، (یہ بے ہوشی امام ابن کثیر کے بقول میدان محشر میں اس وقت ہو گی جب اللہ تعالیٰ فیصلے کرنے کے لیے نزول اجلال فرمائے گا) اور جب ہوش میں آئیں گے تو میں ہوش میں آنے والوں میں سب سے پہلا شخص ہوں گا، میں دیکھوں گا کہ موسیٰ علیہ السلام عرش کا پایہ تھامے کھڑے ہیں، مجھے نہیں معلوم کہ وہ مجھ سے پہلے ہوش میں آئے یا انہیں کوہ طور کی بے ہوشی کے بدلے میں میدان محشر کی بے ہوشی سے مستثنیٰ رکھا گیا۔"

(صحیح بخاری - تفسیر سورة الأعراف - صحیح مسلم، باب فضائل موسیٰ علیہ السلام)

(۲) تیری عظمت و جلالت کا اور اس بات کا کہ میں تیرا عاجز بندہ ہوں، دنیا میں تیرے دیدار کا تحمل نہیں ہو سکتا۔

(۳) یہ ہم کلامی کا دوسرا موقعہ تھا جس سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو مشرف کیا گیا۔ اس سے قبل جب آگ لینے گئے تھے تو اللہ نے ہم کلامی سے نوازا تھا اور پیغمبری عطا فرمائی تھی۔

(۴) گویا تورات تختیوں کی شکل میں عطا فرمائی گئی جس میں ان کے لیے دینی احکام، امر و نہی اور ترغیب و ترہیب کی پوری تفصیل تھی۔

يَا حِينَهَا سَأُورِيكُمْ دَارَ الْفَاسِقِينَ ﴿۱۷﴾

پکڑ لو اور اپنی قوم کو حکم کرو کہ ان کے اچھے اچھے احکام پر عمل کریں،^(۱) اب بہت جلد تم لوگوں کو ان بے حکموں کا مقام دکھلاتا ہوں۔^(۲) (۱۳۵)

میں ایسے لوگوں کو اپنے احکام سے برگشتہ ہی رکھوں گا جو دنیا میں تکبر کرتے ہیں، جس کا ان کو کوئی حق حاصل نہیں اور اگر تمام نشانیاں دیکھ لیں تب بھی وہ ان پر ایمان نہ لائیں،^(۳) اور اگر ہدایت کا راستہ دیکھیں تو اس کو اپنا طریقہ نہ بنائیں اور اگر گمراہی کا راستہ دیکھ لیں تو اس کو اپنا طریقہ بنالیں۔^(۴) یہ اس سبب سے ہے کہ انہوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا اور ان سے غافل رہے۔^(۵) (۱۳۶)

سَأَصْرِفُ عَنْ آلِيكَ الَّذِينَ يَتَكَبَّرُونَ فِي الْأَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَإِنْ يَرَوْا كَلِمًا مِنْ آيَاتِنَا يَتَوَلَّوْنَهَا وَإِنْ يَرَوْا سَبِيلَ الرُّشْدِ لَا يَتَّخِذُوهُ سَبِيلًا وَإِنْ يَرَوْا سَبِيلَ الْعَذَابِ يَتَّخِذُوهُ سَبِيلًا ذَلِكَ بِأَنَّهُمْ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا وَكَانُوا عَنْهَا غَافِلِينَ ﴿۱۷﴾

(۱) یعنی رخصتوں کی ہی تلاش میں نہ رہیں جیسا کہ سہولت پسندوں کا حال ہوتا ہے۔

(۲) مقام (دار) سے مراد یا تو انجام یعنی بلاکت ہے یا اس کا مطلب ہے کہ فاسقوں کے ملک پر تمہیں حکمرانی عطا کروں گا اور اس سے مراد ملک شام ہے جس پر اس وقت عمالقہ کی حکمرانی تھی۔ جو اللہ کے نافرمان تھے۔ (ابن کثیر)

(۳) تکبر کا مطلب ہے اللہ کی آیات و احکام کے مقابلے میں اپنے آپ کو بڑا سمجھنا اور لوگوں کو حقیر گردانا۔ یہ تکبر، انسان کے لیے زیبا نہیں۔ کیونکہ اللہ خالق ہے اور وہ اس کی مخلوق۔ مخلوق ہو کر، خالق کا مقابلہ کرنا اور اس کے احکام و ہدایات سے اعراض و غفلت کرنا کسی طرح بھی جائز نہیں۔ اسی لیے تکبر اللہ تعالیٰ کو سخت ناپسند ہے۔ اس آیت میں تکبر کا نتیجہ بتلایا گیا ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ انہیں آیات الہی سے دور ہی رکھتا ہے اور پھر وہ اتنے دور ہو جاتے ہیں کہ کسی طرح کی بھی نشانی انہیں حق کی طرف لانے میں کامیاب نہیں ہوتی۔ جیسا کہ دوسرے مقام پر فرمایا ﴿ إِنَّ الَّذِينَ حَقَّتْ عَلَيْهِمْ كَلِمَاتُ رَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ * وَكُوجَاءَتْهُمْ كَلِمَاتُ رَبِّكَ حَتَّى يَرَوْا الْعَذَابَ الْأَلِيمَ ﴾ (سورہ یونس - ۹۶-۹۷) ”جن پر تیرے رب کی بات ثابت ہو گئی وہ ایمان نہیں لائیں گے، چاہے ان کے پاس ہر طرح کی نشانی آجائے۔ حتیٰ کہ وہ دردناک عذاب دیکھ لیں۔“

(۴) اس میں احکام الہی سے اعراض کرنے والوں کی ایک اور عادت یا نفسیات کا بیان ہے کہ ہدایت کی کوئی بات ان کے سامنے آئے تو اسے تو نہیں مانتے، البتہ گمراہی کی کوئی چیز دیکھتے ہیں تو اسے فوراً اپنا لیتے اور راہ عمل بنا لیتے ہیں۔ قرآن کریم کی بیان کردہ اس حقیقت کا ہر دور میں مشاہدہ کیا جاسکتا ہے۔ آج ہم بھی ہر جگہ اور ہر معاشرے میں حتیٰ کہ مسلمان معاشروں میں بھی یہی کچھ دیکھ رہے ہیں کہ نیکی منہ چھپائے پھر رہی ہے اور بدی کو ہر کوئی لپک لپک کر اختیار کر رہا ہے۔

(۵) یہ اس بات کا سبب بتلایا جا رہا ہے کہ لوگ نیکی کے مقابلے میں بدی کو اور حق کے مقابلے میں باطل کو کیوں زیادہ اختیار کرتے ہیں؟ یہ سبب ہے آیات الہی کی تکذیب اور ان سے غفلت و اعراض کا۔ یہ ہر معاشرے میں عام ہے۔

اور یہ لوگ جنہوں نے ہماری آیتوں کو اور قیامت کے پیش آنے کو جھٹلایا ان کے سب کام غارت گئے۔ ان کو وہی سزا دی جائے گی جو کچھ یہ کرتے تھے۔^(۱) (۱۳۷)

اور موسیٰ (علیہ السلام) کی قوم نے ان کے بعد اپنے زیوروں کا ایک بچھڑا معبود ٹھہرا لیا جو کہ ایک قالب تھا جس میں ایک آواز تھی۔ کیا انہوں نے یہ نہ دیکھا کہ وہ ان سے بات نہیں کرتا تھا اور نہ ان کو کوئی راہ بتلاتا تھا اس کو انہوں نے معبود قرار دیا اور بڑی بے انصافی کا کام کیا۔^(۲) (۱۳۸)

اور جب نام ہوئے^(۳) اور معلوم ہوا کہ واقعی وہ لوگ گمراہی میں پڑ گئے تو کہنے لگے کہ اگر ہمارا رب ہم پر رحم نہ کرے اور ہمارا گناہ معاف نہ کرے تو ہم بالکل گئے گزرے ہو جائیں گے۔ (۱۳۹)

وَالَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا وَلِقَاءِ الْآخِرَةِ حَبِطَتْ
أَعْمَالُهُمْ هَلْ يُجْرُونَ إِلَّا مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿۱۳۷﴾

وَاتَّخَذَ قَوْمُ مُوسَىٰ مِنْ بَعْدِهِ مِنْ خَلْقِهِمْ عَجَلًا جَدًّا
لَهُ خُورَاءٌ لَهُمْ يُرَوْنَ وَاللَّهُ لَا يَعْلَمُهُمْ وَلَا يَهْدِيَهُمْ سَبِيلًا
لَاتَّخَذُوا لَهُمْ وَكَانُوا ظَالِمِينَ ﴿۱۳۸﴾

وَلَمَّا سَقَطَ فِي أَيْدِيهِمْ وَرَأَوْا أَنَّهُمْ قَدْ ضَلُّوا قَالُوا
لَئِن لَّمْ يَرْحَمْنَا رَبُّنَا وَيَغْفِرْ لَنَا لَكُنَّا مِنَ
الْخَاسِرِينَ ﴿۱۳۹﴾

(۱) اس میں آیات الہی کی تکذیب اور آخرت کا انکار کرنے والوں کا انجام بتلایا گیا ہے کہ چونکہ ان کے عمل کی اساس عدل و حق نہیں، ظلم و باطل ہے۔ اس لیے ان کے نامہ اعمال میں شر ہی شر ہو گا جس کی کوئی قیمت اللہ کے ہاں نہ ہو گی۔ ہاں اس شر کا بدلہ ان کو وہاں ضرور دیا جائے گا۔

(۲) موسیٰ علیہ السلام جب چالیس راتوں کے لیے کوہ طور پر گئے تو پیچھے سے سامری نامی شخص نے سونے کے زیورات اکٹھے کر کے ایک بچھڑا تیار کیا جس میں اس نے جبریل علیہ السلام کے گھوڑے کے سموں کے نیچے کی مٹی بھی، جو اس نے سنبھال کر رکھی ہوئی تھی شامل کر دی، جس میں اللہ نے زندگی کی تاثیر رکھی تھی، جس کی وجہ سے بچھڑا کچھ کچھ بیل کی آواز نکالتا تھا۔ (گو واضح کلام کرنے اور رہنمائی کرنے سے عاجز تھا جیسا کہ قرآن کے الفاظ واضح کر رہے ہیں) اس میں اختلاف ہے کہ وہ فی الواقع گوشت پوست کا بچھڑا بن گیا تھا یا تھا وہ سونے کا ہی۔ لیکن کسی طریقے سے اس میں ہوا داخل ہوتی تو گائے، بیل کی سی آواز اس میں سے نکلتی۔ (ابن کثیر) اس آواز سے سامری نے بنی اسرائیل کو گمراہ کیا کہ تمہارا معبود تو یہ ہے، موسیٰ علیہ السلام بھول گئے ہیں اور وہ معبود کی تلاش میں کوہ طور پر گئے ہیں۔ (یہ واقعہ سورہ طہ میں آئے گا)

(۳) سَقَطَ فِي أَيْدِيهِمْ محاورہ ہے جس کے معنی نام ہونا ہیں، یہ ندامت موسیٰ علیہ السلام کی واپسی کے بعد ہوئی، جب انہوں نے آکر اس پر ان کی زجر و توبیح کی، جیسا کہ سورہ طہ میں ہے۔ یہاں اسے مقدم اس لیے کر دیا گیا ہے کہ ان کا فعل اور قول اکٹھا ہو جائے۔ (فتح القدير)

اور جب موسیٰ (علیہ السلام) اپنی قوم کی طرف واپس آئے غصہ اور رنج میں بھرے ہوئے تو فرمایا کہ تم نے میرے بعد یہ بڑی بری جانشینی کی؟ کیا اپنے رب کے حکم سے پہلے ہی تم نے جلد بازی کر لی، اور جلدی سے تختیاں ایک طرف رکھیں^(۱) اور اپنے بھائی کا سر پکڑ کر ان کو اپنی طرف گھسیٹنے لگے۔ ہارون (علیہ السلام) نے کہا کہ اے میرے ماں جائے! ان لوگوں نے مجھ کو بے حقیقت سمجھا اور قریب تھا کہ مجھ کو قتل کر ڈالیں^(۲) تو تم مجھ پر دشمنوں کو مت ہنساؤ^(۳) اور مجھ کو ان ظالموں کے ذیل میں مت شمار کرو۔^(۴) (۱۵۰)

وَلَمَّا رَجَعَ مُوسَىٰ إِلَىٰ قَوْمِهِ غَضْبَانَ أَسِفًا قَالَ بِئْسَمَا خَلَفْتُمُونِي مِنْ بَعْدِي أَعْمَلْتُمْ أَمْرًا رِجْيًا وَقَالُوا بَلْ كَانُوا بَدِيعًا وَأَخَذَ بِرَأْسِ أَخِيهِ يَجُرُّهُ إِلَيْهِ قَالَ ابْنَ أُمَّ إِنَّ الْقَوْمَ اسْتَضَعُّوْنِي وَكَادُوا يَفْتَنُونِي ۖ فَلَا تُشِيبُنِي الْأَعْدَاءُ وَلَا تَجْعَلْنِي مَعَ الْقَوْمِ الظَّالِمِينَ ۝

(۱) جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے آکر دیکھا کہ وہ پچھڑے کی عبادت میں لگے ہوئے ہیں تو سخت غضب ناک ہوئے اور جلدی میں تختیاں بھی، جو کہہ طور سے لائے تھے، ایسے طور پر رکھیں کہ دیکھنے والوں کو محسوس ہوا کہ انہوں نے نیچے پھینک دی ہیں، جسے قرآن نے ”ڈال دیں“ سے تعبیر کیا ہے۔ تاہم اگر پھینک بھی دی ہوں تو اس میں سوء ادبی نہیں کیونکہ مقصد ان کا تختیوں کی بے ادبی نہیں تھا، بلکہ دینی غیرت و حمیت میں بے خود ہو کر غیر اختیاری طور پر ان سے یہ فعل سرزد ہوا۔

(۲) حضرت ہارون علیہ السلام و موسیٰ علیہ السلام آپس میں لگے بھائی تھے، لیکن یہاں حضرت ہارون علیہ السلام نے ”ماں جائے“ اس لیے کہا کہ اس لفظ میں پیار اور نرمی کا پہلو زیادہ ہے۔

(۳) حضرت ہارون علیہ السلام نے یہ اپنا عذر پیش کیا جس کی وجہ سے وہ قوم کو شرک جیسے جرم عظیم سے روکنے میں ناکام رہے۔ ایک اپنی کمزوری اور دوسرا، بنی اسرائیل کا عناد اور سرکشی کہ وہ انہیں قتل تک کر دینے پر آمادہ ہو گئے تھے اور انہیں اپنی جان بچانے کے لیے خاموش ہونا پڑا، جس کی اجازت ایسے موقعوں پر اللہ نے دی ہے۔

(۴) میری ہی سرزنش کرنے سے دشمن خوش ہوں گے، جب کہ یہ موقع تو دشمنوں کی سرکوبی اور ان سے اپنی قوم کو بچانے کا ہے۔

(۵) اور ویسے بھی عقیدہ و عمل میں مجھے کس طرح ان کے ساتھ شمار کیا جاسکتا ہے؟ میں نے نہ شرک کا ارتکاب کیا، نہ اس کی اجازت دی، نہ اس پر خوش ہوا، صرف خاموش رہا اور اس کے لیے بھی میرے پاس معقول عذر موجود ہے، پھر میرا شمار ظالموں (مشرکوں) کے ساتھ کس طرح ہو سکتا ہے؟ چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے اور اپنے بھائی ہارون علیہ السلام کے لیے مغفرت و رحمت کی دعا مانگی۔

موسیٰ (علیہ السلام) نے کہا کہ اے میرے رب! میری خطا معاف فرما اور میرے بھائی کی بھی اور ہم دونوں کو اپنی رحمت میں داخل فرما اور توبہ رحمت کرنے والوں سے زیادہ رحم کرنے والا ہے۔ (۱۵۱)

بے شک جن لوگوں نے گو سالہ پرستی کی ہے ان پر بہت جلد ان کے رب کی طرف سے غضب اور ذلت اس دنیوی زندگی ہی میں پڑے گی^(۱) اور ہم افترا پردازوں کو ایسی ہی سزا دیا کرتے ہیں۔^(۲) (۱۵۲)

اور جن لوگوں نے گناہ کے کام کئے پھر وہ ان کے بعد توبہ کر لیں اور ایمان لے آئیں تو تمہارا رب اس توبہ کے بعد گناہ معاف کر دینے والا رحمت کرنے والا ہے۔^(۳) (۱۵۳)

اور جب موسیٰ (علیہ السلام) کا غصہ فرد ہوا تو ان تختیوں کو اٹھالیا اور ان کے مضامین میں^(۴) ان لوگوں کے لئے جو اپنے رب سے ڈرتے تھے ہدایت اور رحمت تھی۔^(۵) (۱۵۴)

قَالَ رَبِّ اغْفِرْ لِي وَلَا تَجْعَلْ لِي قَلْبًا مِّنْ غَيْرِكَ وَأَنْتَ أََرْحَمُ الرَّاحِمِينَ ﴿۱۵۱﴾

إِنَّ الَّذِينَ أَخَذُوا الْعَهْلَ سَيْنَا لَهُمْ غَضَبٌ مِّن رَّبِّهِمْ وَذَلَّةٌ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَكَذَلِكَ نَجْزِي الْمُفْتَرِينَ ﴿۱۵۲﴾

وَالَّذِينَ عَمِلُوا السَّيِّئَاتِ ثُمَّ تَابُوا مِن بَعْدِهَا وَأَمَّنُوا بِرَبِّهِمْ إِنَّ رَبَّنَا لَغَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿۱۵۳﴾

وَلِتَنَاسِكْتَ عَنْ مُّوسَى الْعُصْبِ أَخَذَ الْأَلْوَابِ فِي نُسخَتِهَا هُدًى وَرَحْمَةً لِّلَّذِينَ هُمْ لِرَبِّهِمْ يَهْتَبُونَ ﴿۱۵۴﴾

(۱) اللہ کا غضب یہ تھا کہ توبہ کے لیے قتل ضروری قرار پایا۔ اور اس سے قبل جب تک جیتے رہے، ذلت و رسوائی کے وہ مستحق قرار پائے۔

(۲) اور یہ سزا ان ہی کے لیے خاص نہیں ہے، جو بھی اللہ پر افترا کرتا ہے، اس کو ہم یہی سزا دیتے ہیں۔

(۳) ہاں جنہوں نے توبہ کر لی، ان کے لیے اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے۔ معلوم ہوا کہ توبہ سے ہر گناہ معاف ہو جاتا ہے بشرطیکہ خالص توبہ ہو۔

(۴) نُسخَةٌ، فُعْلَةٌ کے وزن پر بمعنی مفعول ہے۔ یہ اس اصل کو بھی کہتے ہیں جس سے نقل کیا جائے اور نقل شدہ کو بھی نسخہ کہہ دیا جاتا ہے۔ یہاں نسخہ سے مراد یا تو وہ اصل الواح ہیں جن پر تورات لکھی گئی تھی، یا اس سے مراد وہ دو سرا نسخہ ہے جو تختیاں زور سے پھینکنے کی وجہ سے ٹوٹ جانے کے بعد اس سے نقل کر کے تیار کیا گیا تھا۔ تاہم صحیح بات پہلی ہی لگتی ہے۔ کیونکہ آگے چل کر آتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان ”تختیوں کو اٹھالیا“ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ تختیاں ٹوٹی نہیں تھیں۔ بہر حال اس کا مرادی مفہوم ”مضامین“ ہے جو ترجمہ میں اختیار کیا گیا ہے۔

(۵) تورات کو بھی، قرآن کریم کی طرح، انہی لوگوں کے لیے ہدایت اور رحمت قرار دیا گیا ہے جو اللہ سے ڈرنے والے ہیں، کیونکہ اصل فائدہ آسمانی کتابوں سے ایسے ہی لوگوں کو ہوتا ہے۔ دوسرے لوگ تو چونکہ اپنے کانوں کو حق کے سننے سے، آنکھوں کو حق کے دیکھنے سے بند کئے ہوئے ہوتے ہیں، اس چشمہ فیض سے وہ بالعموم محروم ہی رہتے ہیں۔

اور موسیٰ (علیہ السلام) نے ستر آدمی اپنی قوم میں سے ہمارے وقت معین کے لئے منتخب کئے، سو جب ان کو زلزلہ نے آپکڑا^(۱) تو موسیٰ (علیہ السلام) عرض کرنے لگے کہ اے میرے پروردگار! اگر تجھ کو یہ منظور ہوتا تو اس سے قبل ہی ان کو اور مجھ کو ہلاک کر دیتا۔ کیا تو ہم میں سے چند بے وقوفوں کی حرکت پر سب کو ہلاک کر دے گا؟ یہ واقعہ محض تیری طرف سے ایک امتحان ہے، ایسے امتحانات سے جس کو تو چاہے گمراہی میں ڈال دے اور جس کو چاہے ہدایت پر قائم رکھے۔ تو ہی تو ہمارا کارساز ہے پس ہم پر مغفرت اور رحمت فرما اور تو سب معافی دینے والوں سے زیادہ اچھا ہے۔^(۲) (۱۵۵)

وَأَخْتَارَ مُوسَىٰ قَوْمَهُ سَبْعِينَ رَجُلًا أَلِيمًا قَلَمًا أَخَذْتَهُمُ
الرِّجْفَةَ قَالَ رَبِّ ارْحَمْنِي وَمَنْ قَبْلِي وَارْحَمِ الَّذِينَ
يَمَافَعَلُ الشُّعْبَاءُ مِنَّا إِنَّ هِيَ إِلَّا فِتْنَتُكَ تُضِلُّ بِهَا مَنْ
تَشَاءُ وَتَهْدِي مَنْ تَشَاءُ إِنَّتَ وَلِيُّنَا فَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا
وَإنتَ خَيْرُ الْغَافِرِينَ ﴿۱۵۵﴾

(۱) ان ستر آدمیوں کی تفصیل اگلے حاشیے میں آرہی ہے۔ یہاں یہ بتایا گیا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کے ستر آدمی چنے اور انہیں کوہ طور پر لے گئے، جہاں بطور عذاب انہیں ہلاک کر دیا گیا، جس پر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا.....

(۲) بنی اسرائیل کے یہ ستر آدمی کون تھے؟ اس میں مفسرین کا اختلاف ہے۔ ایک رائے یہ ہے کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے تورات کے احکام انہیں سنائے تو انہوں نے کہا ہم کیسے یقین کر لیں کہ یہ کتاب واقعی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہی نازل شدہ ہے؟ ہم تو جب تک خود اللہ تعالیٰ کو کلام کرتے ہوئے نہ سن لیں، اسے نہیں مانیں گے۔ چنانچہ انہوں نے ستر برگزیدہ آدمیوں کا انتخاب کیا اور انہیں کوہ طور پر لے گئے۔ وہاں اللہ تعالیٰ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے ہم کلام ہوا جسے ان لوگوں نے بھی سنا۔ لیکن وہاں انہوں نے ایک نیا مطالبہ کر دیا کہ ہم تو جب تک اللہ کو اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھ لیں گے، ایمان نہیں لائیں گے۔ دوسری رائے یہ ہے کہ یہ ستر آدمی وہ ہیں جو پوری قوم کی طرف سے پچھڑے کی عبادت کے جرم عظیم کی توبہ اور معذرت کے لیے کوہ طور پر لے جائے گئے تھے اور وہاں جا کر انہوں نے اللہ کو دیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ تیسری رائے یہ ہے کہ یہ ستر آدمی وہ ہیں کہ جنہوں نے بنی اسرائیل کو پچھڑے کی عبادت کرتے ہوئے دیکھا لیکن انہیں اس سے منع نہیں کیا۔ ایک چوتھی رائے یہ ہے کہ یہ ستر آدمی وہ ہیں جنہیں اللہ کے حکم سے کوہ طور پر لے جانے کے لیے چنا گیا تھا، وہاں جا کر انہوں نے اللہ سے دعائیں کیں۔ جن میں ایک دعایہ بھی تھی کہ ”یا اللہ ہمیں تو وہ کچھ عطا فرما، جو اس سے قبل تو نے کسی کو عطا نہیں کیا اور نہ آئندہ وہ کسی کو عطا کرنا۔“ اللہ تعالیٰ کو یہ دعا پسند نہیں آئی، جس پر وہ زلزلے کے ذریعے سے ہلاک کر دیئے گئے۔ زیادہ مفسرین دوسری رائے کے قائل ہیں اور انہوں نے وہی واقعہ قرار دیا ہے جس کا ذکر سورہ بقرہ آیت ۵۶ میں آیا ہے۔ جہاں ان پر صاعقہ (بجلی کی کڑک) سے موت وارد

وَأَكْتُبُ لَنَا فِي هَذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةً وَفِي الْآخِرَةِ إِنَّا هُنَا نَالِيكَ قَالِ عَذَابِي أُصِيبُ بِهِ مَنْ أَشَاءُ وَرَحْمَتِي وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ فَسَأَلْتَهُمُ الَّذِينَ يَتَّقُونَ وَيُؤْتُونَ الزَّكَاةَ وَالَّذِينَ هُمْ بِآيَاتِنَا يُؤْمِنُونَ ﴿٥٦﴾

اور ہم لوگوں کے نام دنیا میں بھی نیک حالی لکھ دے اور آخرت میں بھی، ہم تیری طرف رجوع کرتے ہیں۔^(۱) اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میں اپنا عذاب اسی پر واقع کرتا ہوں جس پر چاہتا ہوں اور میری رحمت تمام اشیاء پر محیط ہے۔^(۲) تو وہ رحمت ان لوگوں کے نام ضرور لکھوں گا جو اللہ سے ڈرتے ہیں اور زکوٰۃ دیتے ہیں اور جو ہماری آیتوں پر ایمان لاتے ہیں۔ (۱۵۶)

جو لوگ ایسے رسول نبی امی کا اتباع کرتے ہیں جن کو وہ لوگ اپنے پاس تورات و انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں۔^(۳) وہ ان کو نیک باتوں کا حکم فرماتے ہیں اور بری باتوں سے منع کرتے ہیں^(۴) اور پاکیزہ چیزوں کو حلال بتاتے ہیں اور گندی چیزوں کو ان پر حرام فرماتے ہیں اور ان لوگوں پر جو بوجھ اور طوق تھے^(۵) ان کو دور کرتے

أَلَّذِينَ يَتَّبِعُونَ الرَّسُولَ النَّبِيَّ الْأُمِّيَّ الَّذِي يَجِدُونَهُ مَكْتُوبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرَةِ وَالْإِنْجِيلِ يَا أُمَّرُؤهُمُ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَاهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبَاتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبَائِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ فَاَلَّذِينَ

ہونے کا ذکر ہے اور یہاں رَجْفَةً (زلزلے) سے موت کا ذکر ہے۔ اس کی توجیہ میں کہا گیا ہے کہ ممکن ہے دونوں ہی عذاب آئے ہوں اوپر سے بجلی کی کڑک اور نیچے سے زلزلہ۔ بہر حال حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اس دعا والتجا کے بعد کہ اگر ان کو ہلاک ہی کرنا تھا تو اس سے قبل اس وقت ہلاک کرتا جب یہ پچھڑے کی عبادت میں مصروف تھے، اللہ تعالیٰ نے انہیں زندہ کر دیا۔

(۱) یعنی توبہ کرتے ہیں۔

(۲) یہ اس کی وسعت رحمت ہی ہے کہ دنیا میں صالح و فاسق اور مومن و کافر دونوں ہی اس کی رحمت سے فیض یاب ہو رہے ہیں۔ حدیث میں آتا ہے ”اللہ تعالیٰ کی رحمت کے ۱۰۰ حصے ہیں۔ یہ اس کی رحمت کا ایک حصہ ہے کہ جس سے مخلوق ایک دوسرے پر رحم کرتی اور وحشی جانور اپنے بچوں پر شفقت کرتے ہیں اور اس نے اپنی رحمت کے ۹۹ حصے اپنے پاس رکھے ہوئے ہیں۔ صحیح مسلم - نمبر ۲۱۰۸، وابن ماجہ - نمبر ۳۲۹۳

(۳) یہ آیت بھی اس امر کی وضاحت کے لیے نص قطعی کی حیثیت رکھتی ہے کہ رسالت محمدیہ پر ایمان لائے بغیر نجات اخروی ممکن نہیں اور ایمان وہی معتبر ہے جس کی تفصیلات محمد رسول اللہ ﷺ نے بیان فرمائی ہیں۔ اس آیت سے بھی تصور ”وحدت ادیان“ کی جڑک جاتی ہے۔

(۴) معروف، وہ ہے جسے شریعت نے اچھا اور منکر، وہ ہے جسے شریعت نے برا قرار دیا ہے۔

(۵) یہ بوجھ اور طوق وہ ہیں جو پچھلی شریعت میں تھے، مثلاً نفس کے بدلے نفس کا قتل ضروری تھا، (دیت یا معافی نہیں

ہیں۔ سو جو لوگ اس نبی پر ایمان لاتے ہیں اور ان کی حمایت کرتے ہیں اور ان کی مدد کرتے ہیں اور اس نور کا اتباع کرتے ہیں جو ان کے ساتھ بھیجا گیا ہے، ایسے لوگ پوری فلاح پانے والے ہیں۔^(۱) (۱۵۷)

آپ کہہ دیجئے کہ اے لوگو! میں تم سب کی طرف اس اللہ تعالیٰ کا بھیجا ہوا ہوں، جس کی بادشاہی تمام آسمانوں اور زمین میں ہے اس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں وہی زندگی دیتا ہے اور وہی موت دیتا ہے سو اللہ تعالیٰ پر ایمان لاؤ اور اس کے نبی امی پر جو کہ اللہ تعالیٰ پر اور اس کے احکام پر ایمان رکھتے ہیں اور ان کا اتباع کرو

الْمَنُورِ ۱۵۷ وَعَزَّرُوا وَانصَرُوا وَاتَّبَعُوا النُّورَ
الَّذِي أُنزِلَ مَعَهُ أُولَئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ﴿۱۵۷﴾

قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُمْ جَمِيعًا
يَاذُنِي لَهُ مُلْكُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ يُحْيِي
وَيُمِيتُ فَأَلْمُنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ الْبَرِّي الرَّحِيمِ الَّذِي
يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَكَلِمَاتِهِ وَاتَّبِعُوهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ ﴿۱۵۷﴾

تھی) یا جس کپڑے کو نجاست لگ جاتی، اس کا قطع کرنا ضروری تھا، شریعت اسلامیہ نے اسے صرف دھونے کا حکم دیا۔ جس طرح قصاص میں دیت اور معافی کی بھی اجازت دی۔ وغیرہ اور آپ ﷺ نے بھی فرمایا ہے کہ ”مجھے آسان دین خنیفی کے ساتھ بھیجا گیا ہے۔“ (مسند أحمد جلد ۵- ص ۲۶۶- جلد ۶، ص ۱۱۶، ۲۳۳) لیکن افسوس! اس امت نے اپنے طور پر رسوم و رواج کے بہت سے بوجھ اپنے اوپر لاد لیے ہیں اور جاہلیت کے طوق زیب گلو کر لیے ہیں، جن سے شادی اور مرگ دونوں عذاب بن گئے ہیں۔ هَذَا هَا اللَّهُ تَعَالَى .

(۱) ان آخری الفاظ سے بھی یہی بات واضح ہوتی ہے کہ کامیاب وہی لوگ ہوں گے جو حضرت محمد رسول اللہ ﷺ پر ایمان لانے والے اور ان کی پیروی کرنے والے ہوں گے۔ جو رسالت محمدیہ پر ایمان نہیں لائیں گے، وہ کامیاب نہیں، خاسر اور ناکام ہوں گے۔ علاوہ ازیں کامیابی سے مراد بھی آخرت کی کامیابی ہے۔ یہ ممکن ہے کہ کوئی قوم رسالت محمدیہ پر ایمان نہ رکھتی ہو اور اسے دنیاوی خوش حالی و فراوانی حاصل ہو۔ جس طرح اس وقت مغربی اور یورپی اور دیگر بعض قوموں کا حال ہے کہ وہ عیسائی یا یہودی یا کافر و مشرک ہونے کے باوجود مادی ترقی اور خوش حالی میں ممتاز ہیں۔ لیکن ان کی یہ ترقی عارضی و بطور امتحان و استدراج ہے۔ یہ ان کی اخروی کامیابی کی ضمانت یا علامت نہیں۔ اسی طرح ﴿وَ اتَّبَعُوا النُّورَ الَّذِي أُنزِلَ مَعَهُ﴾ سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ المائدہ کی آیت ۱۵ میں نور سے مراد قرآن مجید ہی ہے۔ (جیسا وہاں بھی وضاحت کی گئی تھی) کیوں کہ جو نور آپ کے ساتھ نازل کیا گیا ہے، وہ قرآن مجید ہی ہے۔ اس لیے اس ”نور“ سے خود نبی کریم ﷺ کی ذات مراد نہیں ہے۔ ہاں یہ الگ بات ہے کہ آپ کی صفات میں ایک صفت نور بھی ہے۔ جس سے کفر و شرک کی تاریکیاں دور ہوئیں۔ لیکن آپ کے نوری صفت ہونے سے آپ کا نُورٌ مِّنْ نُورِ اللَّهِ ہونا ثابت نہیں ہو سکتا، جس طرح اہل بدعت یہ ثابت کرتے ہیں۔ (مزید دیکھئے سورۃ المائدہ آیت ۱۵ کا حاشیہ)

وَمِنْ قَوْمِ مُوسَىٰ أُمَّةٍ يَهْدُونَ بِالْحَقِّ وَبِهِ
يَعْتَلُونَ ﴿۱۵۸﴾

وَقَطَعْنَا لَهُمُ اثْنَتَيْ عَشْرَةَ أَسْبَاطًا أَسْمَاءً وَأَوْحَيْنَا إِلَىٰ
مُوسَىٰ إِذِ اسْتَسْقَاهُ قَوْمُهُ أَنِ اضْرِبْ بِعَصَاكَ الْحَجَرَ
فَانبَجَسَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا قَدْ عَلِمَ كُلُّ أُنَاسٍ
مَشْرَبَهُمْ وَطَلَقْنَا عَلَيْهِمُ الْغَمَامَ وَأَنْزَلْنَا عَلَيْهِمُ
الْمَنَّانَ وَالسَّلْوَىٰ كُلًّا مِنْ طَيِّبَاتِ مَا رَزَقْنَاكُمْ وَ
مَا ظَلَمُونَا وَلَكِنْ كَانُوا أَنفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ ﴿۱۵۹﴾

تاکہ تم راہ پر آ جاؤ۔^(۱) (۱۵۸)
اور قوم موسیٰ میں ایک جماعت ایسی بھی ہے جو حق کے
مطابق ہدایت کرتی ہے اور اسی کے مطابق انصاف بھی
کرتی ہے۔^(۲) (۱۵۹)

اور ہم نے ان کو بارہ خاندانوں میں تقسیم کر کے سب کی
الگ الگ جماعت مقرر کر دی^(۳) اور ہم نے موسیٰ (علیہ
السلام) کو حکم دیا جب کہ ان کی قوم نے ان سے پانی مانگا کہ
اپنے عصا کو فلاں پتھر پر مارو پس فوراً اس سے بارہ چشمے
پھوٹ نکلے۔ ہر ہر شخص نے اپنے پانی پینے کا موقع معلوم کر
لیا۔ اور ہم نے ان پر ابر کو سایہ نکلن کیا اور ان کو من
وسلوی (ترنجبین اور ثیرس) پہنچائیں، کھاؤ نفیس چیزوں

(۱) یہ آیت بھی رسالت محمدیہ کی عالم گیر رسالت کے اثبات میں بالکل واضح ہے۔ اس میں اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کو حکم دیا کہ آپ ﷺ کہہ دیجئے کہ اے کائنات کے انسانو! میں سب کی طرف اللہ کا رسول بنا کر بھیجا گیا ہوں۔ یوں آپ ﷺ پوری بنی نوع انسانی کے نجات دہندہ اور رسول ہیں۔ اب نجات اور ہدایت نہ عیسائیت میں ہے نہ یہودیت میں نہ کسی اور مذہب میں۔ نجات اور ہدایت اگر ہے تو صرف اسلام کے اپنانے اور اسے ہی اختیار کرنے میں ہے۔ اس آیت میں اور اس سے پہلی آیت میں بھی آپ ﷺ کو النبی الامی کہا گیا ہے۔ یہ آپ کی ایک خاص صفت ہے۔ امی کے معنی ہیں ان پڑھ۔ یعنی آپ نے کسی استاد کے سامنے زانوئے تلمذت نہیں کیے، کسی سے کسی قسم کی تعلیم حاصل نہیں کی۔ لیکن اس کے باوجود آپ ﷺ نے جو قرآن کریم پیش کیا، اس کے اعجاز و بلاغت کے سامنے دنیا بھر کے فصحاء بلغا عاجز آ گئے اور آپ نے جو تعلیمات پیش کیں، ان کی صداقت و حقانیت کی ایک دنیا معترف ہے، جو اس بات کی دلیل ہے کہ آپ واقعی اللہ کے سچے رسول ہیں ورنہ ایک امی نہ ایسا قرآن پیش کر سکتا ہے اور نہ ایسی تعلیمات بیان کر سکتا ہے جو عدل و انصاف کا بہترین نمونہ اور انسانیت کی فلاح و کامرانی کے لیے ناگزیر ہیں، انہیں اپنائے بغیر دنیا حقیقی امن و سکون اور راحت و عافیت سے ہمکنار نہیں ہو سکتی۔

(۲) اس سے مراد وہی چند لوگ ہیں جو مسلمان ہو گئے تھے، عبد اللہ بن سلام وغیرہ۔ رَضِيَ اللهُ عَنْهُمْ

(۳) أَسْبَاطٌ، سِبْطٌ کی جمع ہے۔ بمعنی پوتا۔ یہاں اسباط قبائل کے معنی میں ہیں۔ یعنی حضرت یعقوب علیہ السلام کے بارہ بیٹوں سے بارہ قبیلے معرض وجود میں آئے، ہر قبیلے پر اللہ تعالیٰ نے ایک ایک نقیب (نگران) بھی مقرر فرما دیا تھا، ﴿وَبَعَثْنَا مِنْهُمُ اثْنَيْ عَشَرَ نَقِيبًا﴾ (المائدہ - ۱۲) یہاں اللہ تعالیٰ ان بارہ قبیلوں کے بعض بعض صفات میں ایک ایک دوسرے سے ممتاز ہونے کی بنا پر ان کے الگ الگ گروہ ہونے کو بطور امتنان کے ذکر فرما رہا ہے۔

سے جو کہ ہم نے تم کو دی ہیں اور انہوں نے ہمارا کوئی نقصان نہیں کیا لیکن اپنا ہی نقصان کرتے تھے۔ (۱۶۰)

اور جب ان کو حکم دیا گیا کہ تم لوگ اس آبادی میں جا کر رہو اور کھاؤ اس سے جس جگہ تم رغبت کرو اور زبان سے یہ کہتے جانا کہ توبہ ہے اور جھکے جھکے دروازہ میں داخل ہونا ہم تمہاری خطائیں معاف کر دیں گے۔ جو لوگ نیک کام کریں گے ان کو مزید برآں اور دیں گے۔ (۱۶۱)

سو بدل ڈالا ان ظالموں نے ایک اور کلمہ جو خلاف تھا اس کلمہ کے جس کی ان سے فرمائش کی گئی تھی، اس پر ہم نے ان پر ایک آفت سماوی بھیجی اس وجہ سے کہ وہ حکم کو ضائع کرتے تھے۔^(۱) (۱۶۲)

اور آپ ان لوگوں سے،^(۲) اس بستی والوں کا^(۳) جو کہ دریائے (شور) کے قریب آباد تھے اس وقت کا حال پوچھئے! جب کہ وہ ہفتہ کے بارے میں حد سے نکل رہے تھے جب کہ ان کے ہفتہ کے روز تو ان کی مچھلیاں ظاہر ہو کر ان کے سامنے آتی تھیں، اور جب ہفتہ کا دن نہ ہوتا تو ان کے سامنے نہ آتی تھیں، ہم ان کی اس طرح پر آزمائش کرتے تھے اس سبب سے کہ وہ بے حکمی کیا

وَأَذَقْنَا لَهُمْ لَهْمُ اسْكُنُوا هَذِهِ الْقَرْيَةَ وَكُلُوا مِنْهَا حَيْثُ يَشَاءُ وَقُولُوا حِطَّةٌ وَادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا نَغْفِرْ لَكُمْ خَطِيئَتِكُمْ سَنَزِيدُ الْمُحْسِنِينَ ﴿۱۶۱﴾

فَبَدَّلَ الَّذِينَ كَلَّمُوا مِنْهُمْ قَوْلًا غَيْرَ الَّذِي قِيلَ لَهُمْ فَأَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِجْزًا مِنَ السَّمَاءِ بِمَا كَانُوا يَظْلِمُونَ ﴿۱۶۲﴾

وَسَأَلْنَاهُمْ عَنِ الْقَرْيَةِ الَّتِي كَانَتْ حَاضِرَةً الْبَحْرِ إِذْ يَعْدُونَ فِي السَّبْتِ إِذْ تَأْتِيهِمْ حِيتَانُهُمْ يَوْمَ سَبْتِهِمْ شُرَعًا وَيَوْمَ لَا تَأْتِيهِمْ إِلَّا تَابِيهَةٌ كَذَلِكَ نَبْلُوهُمْ بِمَا كَانُوا يَفْسُقُونَ ﴿۱۶۳﴾

(۱) ۱۶۰ تا ۱۶۲ آیات میں جو باتیں بیان کی گئی ہیں، یہ وہ ہیں جو پارہ الم، سورہ بقرہ کے آغاز میں بیان کی گئی ہیں۔ وہاں ان کی تفصیل ملاحظہ فرمائی جائے۔

(۲) وَسَأَلْنَاهُمْ میں «هُنَّ» ضمیر سے مراد یہودی ہیں۔ یعنی ان سے پوچھئے۔ اس میں یہودیوں کو یہ بتانا بھی مقصود ہے کہ اس واقعے کا علم نبی کریم ﷺ کو بھی ہے جو آپ ﷺ کی صداقت کی دلیل ہے، کیونکہ اللہ کی طرف سے وحی کے بغیر آپ ﷺ کو اس واقعے کا علم نہیں ہو سکتا تھا۔

(۳) اس بستی کی تعیین میں اختلاف ہے، کوئی اس کا نام ایلہ کوئی طبریہ کوئی ایلیا اور کوئی شام کی کوئی بستی، جو سمندر کے قریب تھی، بتلاتا ہے۔ مفسرین کا زیادہ رجحان «ایلہ» کی طرف ہے جو مدین اور کوه طور کے درمیان دریائے قلزم کے ساحل پر تھی۔

کرتے تھے۔^(۱) (۱۶۳)

اور جب کہ ان میں سے ایک جماعت نے یوں کہا کہ تم ایسے لوگوں کو کیوں نصیحت کرتے ہو جن کو اللہ بالکل ہلاک کرنے والا ہے یا ان کو سخت سزا دینے والا ہے؟^(۲) انہوں نے جواب دیا کہ تمہارے رب کے روبرو عذر کرنے کے لئے اور اس لئے کہ شاید یہ ڈر جائیں۔ (۱۶۳)

سو جب وہ اس کو بھول گئے جو ان کو سمجھایا جاتا تھا^(۳) تو ہم نے ان لوگوں کو تو بچالیا جو اس بری عادت سے منع کیا کرتے تھے اور ان لوگوں کو جو کہ زیادتی کرتے تھے ایک

وَاذْ قَالَتْ اُمَّةٌ مِنْهُمْ لِمَ تَعِظُونَ قَوْمًا لَئِنَّمْ لَمُهِلِكُمُ اَوْ
مُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيدًا اَقَالُوا مَعذِرَةً اِلَى رَبِّكُمْ وَلَعَلَّكُمْ
يَتَّقُونَ ﴿۱۶۳﴾

فَلَمَّا نَسُوا مَا ذُكِّرُوا بِهِ اَبْجَبْنَا الَّذِيْنَ يَنْهَوْنَ عَنِ الشُّؤْمِ
وَآخَذْنَا الَّذِيْنَ ظَلَمُوا بِعَذَابٍ بَیِّنٍ اِيْمًا كَانُوا
يَفْسُقُوْنَ ﴿۱۶۴﴾

(۱) حَبِطَانٌ حُوتٌ (مچھلی) کی جمع ہے۔ شُرْعًا شَارِعٌ کی جمع ہے۔ معنی ہیں پانی کے اوپر ابھرا بھر کر آنے والیاں۔ یہ یہودیوں کے اس واقعے کی طرف اشارہ ہیں جس میں انہیں ہفتے والے دن مچھلیوں کا شکار کرنے سے منع کر دیا گیا تھا۔ لیکن بطور آزمائش ہفتے والے دن مچھلیاں کثرت سے آئیں اور پانی کے اوپر ظاہر ہو کر انہیں دعوت شکار دیتیں۔ اور جب یہ دن گزر جاتا تو اس طرح نہ آئیں۔ بالآخر یہودیوں نے ایک حیلہ کر کے حکم الہی سے تجاوز کیا کہ گڑھے کھود لیے تا کہ مچھلیاں اس میں پھنسی رہیں اور جب ہفتے کا دن گزر جاتا تو پھر انہیں پکڑ لیتے۔

(۲) اس جماعت سے صالحین کی وہ جماعت مراد ہے جو اس حیلے کا ارتکاب بھی نہیں کرتی تھی اور حیلہ گروں کو سمجھا سمجھا کر ان کی اصلاح سے مایوس بھی ہو گئی تھی۔ تاہم کچھ اور لوگ بھی سمجھانے والے تھے جو انہیں وعظ و نصیحت کرتے تھے۔ صالحین کی یہ جماعت انہیں یہ کہتی کہ ایسے لوگوں کو وعظ و نصیحت کا کیا فائدہ جن کی قسمت میں ہلاکت و عذاب الہی ہے۔ یا اس جماعت سے وہی نافرمان اور تجاوز کرنے والے مراد ہیں؛ جب ان کو وعظ کرنے والے نصیحت کرتے تو یہ کہتے کہ جب تمہارے خیال میں ہلاکت یا عذاب الہی ہمارا مقدر ہے تو پھر ہمیں کیوں وعظ کرتے ہو؟ تو وہ جواب دیتے کہ ایک تو اپنے رب کے سامنے معذرت پیش کرنے کے لیے تاکہ ہم تو اللہ کی گرفت سے محفوظ رہیں۔ کیونکہ معصیت الہی کا ارتکاب ہوتے ہوئے دیکھنا اور پھر اسے روکنے کی کوشش نہ کرنا بھی جرم ہے؛ جس پر اللہ تعالیٰ کی گرفت ہو سکتی ہے۔ اور دوسرا فائدہ یہ ہے کہ شاید یہ لوگ حکم الہی سے تجاوز کرنے سے باز ہی آجائیں۔ پہلی تفسیر کی رو سے یہ تین جماعتیں ہوئیں۔ ۱۔ نافرمان اور شکار کرنے والی جماعت ۲۔ وہ جماعت جو بالکل کنارہ کش ہو گئی، نہ وہ نافرمانوں میں تھی نہ منع کرنے والوں میں ۳۔ وہ جماعت جو نافرمان بھی نہیں تھی۔ اور بالکل کنارہ کش بھی نہیں ہوئی تھی۔ بلکہ نافرمانوں کو منع کرتی تھی۔ دوسری تفسیر کی رو سے یہ دو جماعتیں ہوں گی۔ ایک نافرمانوں کی اور دوسری منع کرنے والوں کی۔

(۳) یعنی وعظ و نصیحت کی انہوں نے کوئی پرواہ نہیں کی اور نافرمانی پر اڑے رہے۔

سخت عذاب میں پکڑ لیا اس وجہ سے کہ وہ بے حکمی کیا کرتے تھے۔^(۱) (۱۶۵)

یعنی جب وہ، جس کام سے ان کو منع کیا گیا تھا اس میں حد سے نکل گئے تو ہم نے ان کو کہہ دیا تم ذلیل بند رہنا جاؤ۔^(۲) (۱۶۶)

اور وہ وقت یاد کرنا چاہئے کہ آپ کے رب نے یہ بات بتلا دی کہ وہ ان یہود پر قیامت تک ایسے شخص کو ضرور مسلط کرتا رہے گا جو ان کو سزائے شدید کی تکلیف پہنچاتا رہے گا،^(۳) بلاشبہ آپ کا رب جلدی ہی سزا دے دیتا ہے اور بلاشبہ وہ واقعی بڑی مغفرت اور بڑی رحمت والا ہے۔^(۴) (۱۶۷)

اور ہم نے دنیا میں ان کی مختلف جماعتیں کر دیں۔ بعض ان میں نیک تھے اور بعض ان میں اور طرح تھے اور ہم

فَلَمَّا عَتَوْا عَنْ مَا نُهُوا عَنْهُ قُلْنَا لَهُمْ كُونُوا قِرَدَةً خَاسِئِينَ ﴿۱۶۵﴾

وَإِذْ تَأَذَّنَ رَبُّكَ لَيَبْعَثَنَّ عَلَيْهِمْ إِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ مَنْ يَسُومُهُمْ سُوءَ الْعَذَابِ إِنَّ رَبَّكَ لَسَرِيعُ الْعِقَابِ وَإِنَّهُ لَغَفُورٌ رَحِيمٌ ﴿۱۶۶﴾

وَقَطَعْنَاهُمْ فِي الْأَرْضِ أُمَّمًا مِنْهُمْ الصَّالِحُونَ وَمِنْهُمْ دُونَ ذَلِكَ وَبَلَّوْنَهُمْ بِالْهَسَاتِ وَالسَّيِّئَاتِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ ﴿۱۶۷﴾

(۱) یعنی وہ ظالم بھی تھے، اللہ تعالیٰ کی نافرمانیوں کا ارتکاب کر کے انہوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا اور انہیں جہنم کا ایندھن بنا لیا اور فاسق بھی، کہ اللہ کے حکموں سے سرتابی کو انہوں نے اپنا شیوہ اور وطیرہ بنا لیا۔

(۲) عَتَوْا کے معنی ہیں، جنہوں نے اللہ کی نافرمانی میں حد سے تجاوز کیا۔ مفسرین کے درمیان اس امر میں اختلاف ہے کہ نجات پانے والے صرف وہی تھے، جو منع کرتے تھے اور باقی دونوں عذاب الہی کی زد میں آئے؟ یا زد میں آنے والے صرف معصیت کار تھے؟ اور باقی دو جماعتیں نجات پانے والی تھیں؟ امام ابن کثیر نے دوسری رائے کو ترجیح دی ہے۔

(۳) تَأَذَّنَ، إِذْنًا بمعنی إِعْلَامٍ (خبر دینا، بتلا دینا) سے باب تفعّل ہے۔ یعنی وہ وقت بھی یاد کرو! جب آپ کے رب نے ان یہودیوں کو اچھی طرح باخبر کر دیا یا بتلا دیا تھا لَيَبْعَثَنَّ میں لام تآکید ہے جو قسم کے معنی کا فائدہ دیتا ہے۔ یعنی قسم کھا کر نہایت تآکید کے ساتھ اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے کہ وہ ان پر قیامت تک ایسے لوگوں کو مسلط کرتا رہے گا جو ان کو سخت عذاب میں مبتلا رکھیں گے، چنانچہ یہودیوں کی پوری تاریخ اسی زلت و مسکت اور غلامی و محکومی کی تاریخ ہے جس کی خبر اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں دی ہے۔ اسرائیل کی موجودہ حکومت قرآن کی بیان کردہ اس حقیقت کے خلاف نہیں ہے اس لیے کہ وہ قرآن ہی کے بیان کردہ اسْتَشْنَا وَحَبَلْنَا مِنَ النَّاسِ کی مظہر ہے جو قرآنی حقیقت کے خلاف نہیں بلکہ اس کی مؤید ہے۔ (تفصیل کے لیے دیکھئے آل عمران - ۱۱۲ کا حاشیہ)

(۴) یعنی اگر ان میں سے کوئی توبہ کر کے مسلمان ہو جائے گا تو وہ اس زلت و سوء عذاب سے بچ جائے گا۔

ان کو خوش حالیوں اور بد حالیوں سے آزما تے رہے کہ شاید باز آجائیں۔^(۱) (۱۶۸)

پھر ان کے بعد ایسے لوگ ان کے جانشین ہوئے^(۲) کہ کتاب کو ان سے حاصل کیا وہ اس دنیائے فانی کا مال متاع لے لیتے ہیں^(۳) اور کہتے ہیں کہ ہماری ضرور مغفرت ہو جائے گی^(۴) حالانکہ اگر ان کے پاس ویسا ہی مال متاع آنے لگے تو اس کو بھی لے لیں گے۔ کیا ان سے اس کتاب کے اس مضمون کا عہد نہیں لیا گیا کہ اللہ کی طرف بجز حق بات کے اور کسی بات کی نسبت نہ کریں،^(۵) اور انہوں نے اس کتاب میں جو کچھ تھا اس کو پڑھ لیا^(۶) اور آخرت والا گھران لوگوں کے لئے بہتر ہے جو تقویٰ رکھتے ہیں، پھر کیا تم نہیں سمجھتے۔ (۱۶۹)

اور جو لوگ کتاب کے پابند ہیں اور نماز کی پابندی کرتے ہیں، ہم ایسے لوگوں کا جو اپنی اصلاح کریں ثواب ضائع نہ کریں گے۔^(۷) (۱۷۰)

فَخَلَفَ مِنْ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ وَرِثُوا الْكِتَابَ يَأْخُذُونَ عَرَضَ هَذَا الْأَدْنَىٰ وَيَقُولُونَ سَيُغْفَرُ لَنَا وَإِن يَأْتِهِمْ عَرَضٌ مِّثْلَهُ يَأْخُذُوهُ أَلَمْ يُؤْخَذْ عَلَيْهِمْ مِيثَاقُ الْكِتَابِ أَن لَا يَقُولُوا عَلَى اللَّهِ إِلَّا الْحَقَّ وَدَرَسُوا مَا فِيهِ وَاللَّذَابِ الْأَخْرَجُ خَيْرٌ لِلَّذِينَ يُتَّقُونَ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ۝

وَالَّذِينَ يُؤْتُونَ بِالْكِتَابِ وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ إِنَّا لَا نَضْمِعُ أَجْرَ الْمُصْلِحِينَ ۝

(۱) اس میں یہود کے مختلف گروہوں میں بٹ جانے اور ان میں سے بعض کے نیک ہونے کا ذکر ہے۔ اور ان کو دونوں طریقوں سے آزمائے جانے کا بیان ہے کہ شاید وہ اپنی حرکتوں سے باز آجائیں اور اللہ کی طرف رجوع کریں۔

(۲) خَلَفَ (لام پر فتح کے ساتھ) اولاد صالح کو اور خَلَفَ (بِسُكُونِ اللَّامِ) تالاق اولاد کو کہتے ہیں۔ اردو میں بھی ناخلف کی ترکیب تالاق اولاد کے معنی میں مستعمل ہے۔

(۳) أَدْنَىٰ، دُنُوٌّ (قریب) سے ماخوذ ہے یعنی قریب کا مال حاصل کرتے ہیں جس سے دنیا مراد ہے یا یہ دنائۃ سے ماخوذ ہے جس سے مراد حقیر اور گرا پڑا مال ہے۔ مطلب دونوں سے ان کے دنیا کے مال و متاع کے حرص کی وضاحت ہے۔

(۴) یعنی طالب دنیا ہونے کے باوجود، مغفرت کی امید رکھتے ہیں۔ جیسے آج کل کے مسلمانوں کا بھی حال ہے۔

(۵) اس کے باوجود وہ اللہ کی طرف جھوٹی باتیں منسوب کرنے سے باز نہیں آتے، مثلاً وہی مغفرت کی بات، جو اوپر گزری۔

(۶) اس کا ایک دوسرا مفہوم مٹانا بھی ہو سکتا ہے، جیسے دَرَسَتِ الرِّيحُ الْأَنْثَارَ (ہوا نے نشانات مٹا ڈالے) یعنی کتاب کی باتوں کو مٹا ڈالا، محو کر دیا یعنی ان پر عمل ترک کر دیا۔

(۷) ان لوگوں میں سے جو تقویٰ کا راستہ اختیار کر لیں، کتاب کو مضبوطی سے تھام لیں، جس سے مراد اصلی تورات ہے

وَلَا تَقْنَنَ الْجَبَلُ فَوْقَهُمْ كَأَنَّهُ ظُلَّةٌ وَظَنُّوا أَنَّهُ وَاقِعٌ بِهِمْ ۗ
حُنْدًا وَمَا أَنبَأْنِيكَ يَبْقُوْنَ ۗ وَآذُكُورًا مَّا فِيهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ﴿١٤١﴾

وَ إِذْ أَخَذَ رَبُّكَ مِن بَنِي آدَمَ مِنْ ظُهُورِهِمْ
ذُرِّيَّتَهُمْ وَأَشْهَدَهُمْ عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ أَلَسْتُ
بِرَبِّكُمْ قَالُوا بَلَىٰ شَهِدْنَا أَن نَقُولُوا يَوْمَ
الْقِيَامَةِ إِنَّا كُنَّا عَنْ هَذَا غَافِلِينَ ﴿١٤٢﴾

اور وہ وقت بھی قابل ذکر ہے جب ہم نے پہاڑ کو اٹھا کر
ساتبان کی طرح ان کے اوپر معلق کر دیا اور ان کو یقین ہو گیا
کہ اب ان پر گرا اور کہا کہ جو کتاب ہم نے تم کو دی ہے
اسے مضبوطی کے ساتھ قبول کرو اور یاد رکھو جو احکام اس
میں ہیں اس سے توقع ہے کہ تم متقی بن جاؤ۔ (۱۴۱)

اور جب آپ کے رب نے اولاد آدم کی پشت سے ان کی
اولاد کو نکالا اور ان سے ان ہی کے متعلق اقرار لیا کہ کیا میں
تمہارا رب نہیں ہوں؟ سب نے جواب دیا کیوں نہیں! ہم
سب گواہ بنتے ہیں۔ (۱۴۲) تاکہ تم لوگ قیامت کے روز یوں نہ
کہو کہ ہم تو اس سے محض بے خبر تھے۔ (۱۴۲)

اور جس پر عمل کرتے ہوئے نبوت محمدی پر ایمان لے آئیں، نماز وغیرہ کی پابندی کریں، تو اللہ ایسے مصلحین کا اجر ضائع
نہیں کرے گا۔ اس میں ان اہل کتاب (سیاق کلام سے یہاں بطور خاص یہود) کا ذکر ہے جو تقویٰ، تمسک بالکتاب اور
اقامت صلوة کا اہتمام کریں اور ان کے لیے آخرت کی خوش خبری ہے۔ اس سے مطلب یہ ہے کہ وہ مسلمان ہو جائیں
اور رسالت محمدیہ پر ایمان لے آئیں۔ کیونکہ اب پیغمبر آخر الزمان حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ پر ایمان لائے بغیر نجات
اخروی ممکن نہیں۔

(۱) یہ اس وقت کا واقعہ ہے جب حضرت موسیٰ علیہ السلام ان کے پاس تورات لائے اور اس کے احکام ان کو سنائے۔ تو
انہوں نے پھر حسب عادت ان پر عمل کرنے سے انکار و اعراض کیا، جس پر اللہ تعالیٰ نے ان پر پہاڑ کو بلند کر دیا کہ تم پر
گرا کر تمہیں کچل دیا جائے گا، جس سے ڈرتے ہوئے انہوں نے تورات پر عمل کرنے کا عہد کیا۔ بعض کہتے ہیں کہ رفع
جبل کا یہ واقعہ ان کے مطالبے پر پیش آیا، جب انہوں نے کہا کہ ہم تورات پر عمل اس وقت کریں گے جب اللہ تعالیٰ
پہاڑ کو ہمارے اوپر بلند کر کے دکھائے۔ لیکن پہلی بات زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے وَاللَّهُ أَعْلَمُ۔ یہاں مطلق پہاڑ کا ذکر
ہے۔ لیکن اس سے قبل سورہ بقرہ آیت ۶۳ اور آیت ۹۳ میں دو جگہ اس واقعہ کا ذکر آیا ہے، وہاں اس کا نام صراحت
کے ساتھ کوہ طور بتلایا گیا ہے۔

(۲) یہ عَهْدِ اَلَسْتُ كَمَا تَا ہے جو اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ سے بنی ہوئی ترکیب ہے۔ یہ عہد حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق کے
بعد ان کی پشت سے ہونے والی تمام اولاد سے لیا گیا۔ اس کی تفصیل ایک صحیح حدیث میں اس طرح آتی ہے کہ ”عرفہ
والے دن نعمان جگہ میں اللہ تعالیٰ نے اصلاب آدم سے عہد (میشاق) لیا۔ پس آدم کی پشت سے ان کی ہونے والی تمام
اولاد کو نکالا اور اس کو اپنے سامنے پھیلا دیا اور ان سے پوچھا، ”کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟“ سب نے کہا ”بلیٰ،
شہدنا“ ”کیوں نہیں۔ ہم سب رب ہونے کی گواہی دیتے ہیں“۔ (مسند احمد۔ جلد ۲۷، ص ۲۷۲ والحاکم۔ جلد

یایوں کہو کہ پہلے پہلے شرک تو ہمارے بڑوں نے کیا اور ہم ان کے بعد ان کی نسل میں ہوئے، سو کیا ان غلط راہ والوں کے فعل پر تو ہم کو ہلاکت میں ڈال دے گا؟^(۱) (۱۷۳)

ہم اسی طرح آیات کو صاف صاف بیان کرتے ہیں اور تاکہ وہ باز آجائیں۔ (۱۷۴)

اور ان لوگوں کو اس شخص کا حال پڑھ کر سنائیے کہ جس کو ہم نے اپنی آیتیں دیں پھر وہ ان سے بالکل ہی نکل گیا، پھر شیطان اس کے پیچھے لگ گیا سو وہ گمراہ لوگوں میں شامل ہو گیا۔^(۲) (۱۷۵)

اور اگر ہم چاہتے تو اس کو ان آیتوں کی بدولت بلند مرتبہ کر دیتے لیکن وہ تو دنیا کی طرف مائل ہو گیا اور اپنی

أَوْ تَقُولُوا إِنَّمَا أَشْرَكَ آبَاؤُنَا مِنْ قَبْلُ وَكُنَّا ذُرِّيَّةً مِنْ بَعْدِهِمْ أَفَتُهْلِكُنَا بِمَا فَعَلَ الْمُبْطِلُونَ ﴿۱۷۳﴾

وَكَذَلِكَ نَقُصُّ عَلَيْكَ الْقِصَّةَ الْأُولَىٰ وَلَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ ﴿۱۷۴﴾

وَإِنَّا لَعَلَّمْنَاهُ إِتِنَانَهُ أَيَتِنَانَهُ إِتِنَانَهُ فَانْتَسَخْنَا مِنْهَا فَأَتْبَعَهُ الشَّيْطَانُ فَكَانَ مِنَ الْغَاوِينَ ﴿۱۷۵﴾

وَلَوْ شِئْنَا لَوْفَعْنَاهُ بِهَا وَلَآئِكُنَّ أَخْتَدُوا إِلَى الْأَرْضِ وَاتَّبَعَهُ هَوَاهُ فَمَثَلُهُ كَمَثَلِ الْكَلْبِ إِن يَحْمِلْ عَلَيْهِ يَلْهَثْ

۲ ص ۵۳۳، صحیحہ و وافقہ الذہبی، امام شوکانی اس حدیث کی بابت لکھتے ہیں وَإِسْنَادُهُ لَا مَطْعَنَ فِيهِ (فتح القدير) ”اس کی سند میں کوئی طعن نہیں“ نیز امام شوکانی فرماتے ہیں۔ ”یہ عالم ذر کہلاتا ہے اس کی یہی تفسیر صحیح اور حق ہے جس سے عدول اور کسی اور مفہوم کی طرف جانا صحیح نہیں ہے کیونکہ یہ مرفوع حدیث اور آثار صحابہ سے ثابت ہے اور اسے مجاز پر بھی محمول کرنا جائز نہیں ہے۔“ بہر حال اللہ کی ربوبیت کی یہ گواہی ہر انسان کی فطرت میں ودیعت ہے۔ اسی مفہوم کو رسول اللہ ﷺ نے اس طرح بیان فرمایا ہے کہ ”ہر بچہ فطرت پر پیدا ہوتا ہے، پس اس کے ماں باپ اس کو یہودی یا نصرانی یا مجوسی بنا دیتے ہیں۔ جس طرح جانور کا بچہ صحیح مسلم پیدا ہوتا ہے، اس کا ناک، کان کٹا نہیں ہوتا۔“ (صحیح بخاری۔ کتاب الجنائز و مسلم۔ کتاب القدر اور صحیح مسلم کی روایت ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ”میں نے اپنے بندوں کو حنیف (اللہ کی طرف یکسوئی سے متوجہ ہونے والا) پیدا کیا ہے۔ پس شیطان ان کو ان کے دین (فطری) سے گمراہ کر دیتا ہے۔ الحدیث (صحیح مسلم۔ کتاب الجنة) یہ فطرت یا دین فطرت، یہی رب کی توحید اور اس کی نازل کردہ شریعت ہے جو اب اسلام کی صورت میں محفوظ اور موجود ہے۔

(۱) یعنی ہم نے یہ اخذ عمد اور اپنی ربوبیت کی گواہی اس لیے لی تاکہ تم یہ عذر پیش نہ کر سکو کہ ہم تو غافل تھے یا ہمارے باپ دادا شرک کرتے آئے تھے، یہ عذر قیامت والے دن بارگاہ الہی میں مسوع نہیں ہوں گے۔

(۲) مفسرین نے اسے کسی ایک متعین شخص سے متعلق قرار دیا ہے جسے کتاب الہی کا علم حاصل تھا لیکن پھر وہ دنیا اور شیطان کے پیچھے لگ کر گمراہ ہو گیا۔ تاہم اس کی تعین میں کوئی مستند بات مروی بھی نہیں۔ اس لیے اس تکلف کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ عام ہے اور ایسے افراد ہر دور میں ہوتے رہے ہیں، جو بھی اس صفت کا حامل ہو گا، وہ اس کا مصداق قرار پائے گا۔

نفسانی خواہش کی پیروی کرنے لگا سو اس کی حالت کتے کی سی ہو گئی کہ اگر تو اس پر حملہ کرے تب بھی ہانپے یا اس کو چھوڑ دے تب بھی ہانپے،^(۱) یہی حالت ان لوگوں کی ہے جنہوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا۔ سو آپ اس حال کو بیان کر دیجئے شاید وہ لوگ کچھ سوچیں۔^(۲) (۱۷۶)

ان لوگوں کی حالت بھی بری حالت ہے^(۳) جو ہماری آیات کو جھٹلاتے ہیں اور وہ اپنا نقصان کرتے ہیں۔ (۱۷۷)

جس کو اللہ ہدایت کرتا ہے سو ہدایت پانے والا وہی ہوتا ہے اور جس کو وہ گمراہ کر دے سو ایسے ہی لوگ خسارے میں پڑنے والے ہیں۔^(۴) (۱۷۸)

اور ہم نے ایسے بہت سے جن اور انسان دوزخ کے لئے پیدا کئے ہیں،^(۵) جن کے دل ایسے ہیں جن سے نہیں سمجھتے اور جن کی آنکھیں ایسی ہیں جن سے نہیں دیکھتے اور جن کے کان ایسے ہیں جن سے نہیں سنتے۔ یہ لوگ چوپایوں کی طرح ہیں بلکہ یہ ان سے بھی

أَوْ تَرَكُهُ يَلْهَثُ ذَلِكَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِينَ كَذَّبُوا
بِآيَاتِنَا فَاقْصُصِ الْقَصَصَ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُونَ ﴿۱۷۶﴾

سَاءَ مَثَلًا لِّلْقَوْمِ الَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا وَانفُسَهُمْ كَانُوا
يَظْلِمُونَ ﴿۱۷۷﴾

مَنْ يَهْدِ اللَّهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِىٌّ وَمَنْ يُضِلِّمْ فَأُولَٰئِكَ
هُمُ الْخَاسِرُونَ ﴿۱۷۸﴾

وَلَقَدْ ذَرَأْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالإِنسِ لَهُمْ قُلُوبٌ لَّا
يَفْقَهُونَ بِهَا وَلَهُمْ أَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُونَ بِهَا وَلَهُمْ آذَانٌ
لَّا يَسْمَعُونَ بِهَا أُولَٰئِكَ كَالْإِنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ
أُولَٰئِكَ هُمُ الْغَافِلُونَ ﴿۱۷۹﴾

(۱) لَهَثَ کہتے ہیں تھکاوٹ یا پیاس وغیرہ کی وجہ سے زبان کے باہر نکالنے کو۔ کتے کی یہ عادت ہے کہ تم اسے ڈانٹو ڈپٹو یا اس کے حال پر چھوڑ دو، دونوں حالتوں میں وہ بھونکنے سے باز نہیں آتا اسی طرح اس کی یہ عادت بھی ہے کہ وہ شکم میر ہو یا بھوکا، تندرست ہو یا بیمار، تھکا ماندہ ہو یا توانا، ہر حال میں زبان باہر نکالے ہانپتا رہتا ہے۔ یہی حال ایسے شخص کا ہے، اسے وعظ کرو یا نہ کرو، اس کا حال ایک ہی رہے گا اور دنیا کے مال و متاع کے لیے اس کی رال ٹپکتی رہے گی۔

(۲) اور اس قسم کے لوگوں سے عبرت حاصل کر کے، گمراہی سے بچیں اور حق کو اپنائیں۔

(۳) مثلاً تیز ہے۔ اصل عبارت یوں ہوگی سَاءَ مَثَلًا! مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا۔

(۴) یہ اس کے قانون مشیت کا بیان ہے جس کی وضاحت پہلے دو تین مرتبہ کی جا چکی ہے۔

(۵) اس کا تعلق تقدیر سے ہے۔ یعنی ہر انسان اور جن کی بابت اللہ کو علم تھا کہ وہ دنیا میں جا کر اچھے یا بُرے کیا عمل کرے گا، اس کے مطابق اس نے لکھ رکھا ہے۔ یہاں انہی دوزخیوں کا ذکر ہے جنہیں اللہ کے علم کے مطابق دوزخ والے ہی کام کرنے تھے۔ آگے ان کی مزید صفات بیان کر کے بتا دیا گیا کہ جن لوگوں کے اندر یہ چیزیں اسی انداز میں ہوں جس کا ذکر یہاں کیا گیا ہے، تو سمجھ لو کہ اس کا انجام برا ہے۔

زیادہ گمراہ ہیں۔^(۱) یہی لوگ غافل ہیں۔ (۱۷۹)
 اور اچھے اچھے نام اللہ ہی کے لئے ہیں سو ان ناموں سے
 اللہ ہی کو موسوم کیا کرو^(۲) اور ایسے لوگوں سے تعلق بھی
 نہ رکھو جو اس کے ناموں میں کج روی کرتے ہیں،^(۳) ان
 لوگوں کو ان کے کئے کی ضرور سزا ملے گی۔ (۱۸۰)

وَاللَّهُ الْأَسْمَاءُ الْحُسْنَىٰ فَادْعُوهُ بِهَا وَذَرُوا الَّذِينَ يُلْحِدُونَ
 فِي أَسْمَائِهِ سَيُجْزَوْنَ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿۱۷۹﴾

(۱) یعنی دل، آنکھ، کان یہ چیزیں اللہ نے اس لیے دی ہیں کہ انسان ان سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے پروردگار کو سمجھے،
 اس کی آیات کا مشاہدہ کرے اور حق کی بات کو غور سے سنے۔ لیکن جو شخص ان مشاعرے سے یہ کام نہیں لیتا، وہ گویا ان
 سے عدم انتفاع (فائدہ نہ اٹھانے) میں چوپایوں کی طرح بلکہ ان سے بھی زیادہ گمراہ ہے۔ اس لیے کہ چوپایے تو پھر بھی
 اپنے نفع نقصان کا کچھ شعور رکھتے ہیں اور نفع والی چیزوں سے نفع اٹھاتے اور نقصان دینے والی چیزوں سے بچ کر رہتے
 ہیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی ہدایت سے اعراض کرنے والے شخص کے اندر تو یہ تمیز کرنے کی صلاحیت ہی ختم ہو جاتی ہے کہ
 اس کے لیے مفید چیز کون سی ہے اور مضر کون سی؟ اسی لیے اگلے جملے میں انہیں غافل بھی کہا گیا ہے۔

(۲) حُسْنَىٰ أَحْسَنُ کی تائید ہے۔ اللہ کے ان اچھے ناموں سے مراد اللہ کے وہ نام ہیں جن سے اس کی مختلف صفات،
 اس کی عظمت و جلالت اور اس کی قدرت و طاقت کا اظہار ہوتا ہے۔ صحیحین کی حدیث میں ان کی تعداد ۹۹ (ایک کم سو)
 بتائی گئی۔ اور فرمایا کہ ”جو ان کو شمار کرے گا، جنت میں داخل ہو گا“ اللہ تعالیٰ طاق ہے طاق کو پسند فرماتا ہے۔“
 (بخاری، کتاب الدعوات، باب لله ما سعة اسم غیر واحد۔ ”مسلم، کتاب الذکر، باب فی أسماء اللہ تعالیٰ
 وفضل من أحصاها) شمار کرنے کا مطلب ہے، ان پر ایمان لانا، یا ان کو گننا اور انہیں ایک ایک کر کے بطور تبرک
 اخلاص کے ساتھ پڑھنا، یا ان کا حفظ، ان کے معانی کا جاننا اور ان سے اپنے کو متصف کرنا۔ (مرقاۃ شرح مشکوٰۃ، کتاب
 الدعوات، باب أسماء اللہ تعالیٰ) بعض روایات میں ان ۹۹ ناموں کو ذکر کیا گیا ہے لیکن یہ روایات ضعیف ہیں اور علمائے
 انہیں مدرج قرار دیا ہے یعنی راویوں کا اضافہ۔ وہ نبی ﷺ کی حدیث کا حصہ نہیں ہیں۔ نیز علمائے یہ بھی وضاحت کی
 ہے کہ اللہ کے ناموں کی تعداد ۹۹ میں منحصر نہیں ہے۔ بلکہ اس سے زیادہ ہیں۔ (ابن کثیر، فتح القدر)

(۳) الحاد کے معنی ہیں کسی ایک طرف مائل ہونا۔ اسی سے لحد ہے جو اس قبر کو کہا جاتا ہے جو ایک طرف بنائی جاتی ہے۔
 دین میں الحاد اختیار کرنے کا مطلب کج روی اور گمراہی اختیار کرنا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ناموں میں الحاد (کج روی) کی تین
 صورتیں ہیں۔ ۱- اللہ تعالیٰ کے ناموں میں تبدیلی کر دی جائے۔ جیسے مشرکین نے کیا۔ مثلاً اللہ کے ذاتی نام سے اپنے
 ایک بت کا نام لات اور اس کے صفاتی ناموں عَزِيزٌ سے عَزْزَىٰ بنا لیا۔ ۲- یا اللہ کے ناموں میں اپنی طرف سے اضافے کر
 لینا، جس کا حکم اللہ نے نہیں دیا۔ ۳- یا اس کے ناموں میں کمی کر دی جائے مثلاً اسے کسی ایک ہی مخصوص نام سے پکارا
 جائے اور دوسرے صفاتی ناموں سے پکارنے کو برا سمجھا جائے۔ (فتح القدر) اللہ کے ناموں میں الحاد کی ایک صورت یہ
 بھی ہے کہ ان میں تاویل یا تعطیل یا تشبیہ سے کام لیا جائے (ایسر التفسیر) جس طرح معتزلہ، معتلہ اور مشبہ وغیرہ گمراہ

اور ہماری مخلوق میں ایک جماعت ایسی بھی ہے جو حق کے موافق ہدایت کرتی ہے اور اس کے موافق انصاف بھی کرتی ہے۔ (۱۸۱)

اور جو لوگ ہماری آیات کو جھٹلاتے ہیں ہم ان کو بدرتج (گرفت میں) لئے جا رہے ہیں اس طور پر کہ ان کو خبر بھی نہیں۔ (۱۸۲)

اور ان کو مہلت دیتا ہوں بے شک میری تدبیر بڑی مضبوط ہے۔ (۱۸۳)^(۱)

کیا ان لوگوں نے اس بات پر غور نہ کیا کہ ان کے ساتھی کو ذرا بھی جنون نہیں وہ تو صرف ایک صاف صاف ڈرانے والے ہیں۔ (۱۸۳)^(۲)

اور کیا ان لوگوں نے غور نہیں کیا آسمانوں اور زمین کے عالم میں اور دوسری چیزوں میں جو اللہ نے پیدا کی ہیں اور اس بات میں کہ ممکن ہے کہ ان کی اجل قریب ہی آ پہنچی ہو۔ (۳) پھر قرآن کے بعد کون سی بات پر یہ لوگ ایمان لائیں گے؟ (۱۸۵)^(۳)

وَمِمَّنْ خَلَقْنَا أُمَّةً يَهْدُونَ بِالْحَقِّ وَبِهِ يَعْدِلُونَ ﴿۱۸۱﴾

وَالَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا سَنَسْتَدْرِجُهُم مِّنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُونَ ﴿۱۸۲﴾

وَأَنزِلْ لَهُم مِّنْ كَثْرَةِ رَبِّكَ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِنْ خَمْبٍ ﴿۱۸۳﴾

أَوَلَمْ يَتَفَكَّرُوا مَا بِصَاحِبِهِمْ مِنْ حِنَّةٍ إِنْ هُوَ إِلَّا نَذِيرٌ مُّبِينٌ ﴿۱۸۳﴾

أَوَلَمْ يَنْظُرُوا فِي مَلَكُوتِ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَمَا خَلَقَ اللَّهُ مِنْ شَيْءٍ وَإِن عَلَىٰ أَنْ يَكُونَ قَدًا قَرِيبًا جَاهِلُهُمْ فِي آبَائِهِمْ بَعْدَ ذَلِكَ يَوْمًا ﴿۱۸۵﴾

فروق کا طریقہ رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ ان سب سے بچ کر رہو۔

(۱) یہ وہی استدراج و امسال ہے جو بطور امتحان اللہ تعالیٰ افراد اور قوموں کو دیتا ہے۔ پھر جب اس کی مشیت مؤاخذہ کرنے کی ہوتی ہے تو کوئی اس سے بچانے پر قادر نہیں ہو سکتا، کیونکہ اس کی تدبیر بڑی مضبوط ہے۔

(۲) صَاحِبٌ سے مراد نبی کریم ﷺ کی ذات گرامی ہے جن کی بابت مشرکین کبھی ساحراور کبھی مجنون (نعوذ باللہ) کہتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا یہ تمہارے عدم تفکر کا نتیجہ ہے۔ وہ تو ہمارا پیغامبر ہے جو ہمارے احکام پہنچانے والا اور ان سے غفلت و اعراض کرنے والوں کو ڈرانے والا ہے۔

(۳) مطلب یہ ہے کہ ان چیزوں پر بھی اگر یہ غور کریں تو یقیناً یہ اللہ پر ایمان لے آئیں، اس کے رسول کی تصدیق اور اس کی اطاعت اختیار کر لیں اور انہوں نے جو اللہ کے شریک بنا رکھے ہیں، انہیں چھوڑ دیں اور اس بات سے ڈریں کہ انہیں موت اس حال میں آجائے کہ وہ کفر پر قائم ہوں۔

(۴) حَدِيثٌ سے مراد یہاں قرآن کریم ہے۔ یعنی نبی ﷺ کے انذار و تہدید اور قرآن کریم کے بعد بھی اگر یہ ایمان نہ لائیں تو ان سے بڑھ کر انہیں ڈرانے والی چیز اور کیا ہوگی جو اللہ کی طرف سے نازل ہو اور پھر یہ اس پر ایمان لائیں؟

جس کو اللہ تعالیٰ گمراہ کر دے اس کو کوئی راہ پر نہیں لا سکتا۔ اور اللہ تعالیٰ ان کو ان کی گمراہی میں بھٹکتے ہوئے چھوڑ دیتا ہے۔ (۱۸۶)

یہ لوگ آپ سے قیامت^(۱) کے متعلق سوال کرتے ہیں کہ اس کا وقوع کب ہو گا؟^(۲) آپ فرمادیجئے کہ اس کا علم صرف میرے رب ہی کے پاس ہے،^(۳) اس کے وقت پر اس کو سوا اللہ کے کوئی اور ظاہر نہ کرے گا۔ وہ آسمانوں اور زمین میں بڑا بھاری (حادثہ) ہو گا^(۴) وہ تم پر محض اچانک آ پڑے گی۔ وہ آپ سے اس طرح پوچھتے ہیں جیسے گویا آپ اس کی تحقیقات کر چکے ہیں۔^(۵) آپ فرمادیجئے کہ اس کا علم خاص اللہ ہی کے پاس ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔ (۱۸۷)

آپ فرمادیجئے کہ میں خود اپنی ذات خاص کے لئے کسی نفع کا اختیار نہیں رکھتا اور نہ کسی ضرر کا، مگر اتنا ہی کہ جتنا اللہ نے چاہا ہو اور اگر میں غیب کی باتیں جانتا ہوتا تو میں بہت سے منافع حاصل کر لیتا اور کوئی نقصان مجھ کو نہ پہنچتا میں تو محض ڈرانے والا اور بشارت دینے والا ہوں ان

مَنْ يُضِلِلِ اللَّهُ فَلَا هَادِيَ لَهُ ۖ وَيَذَرُهُمْ فِي طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُونَ ﴿۱۸۶﴾

يَسْأَلُونَكَ عَنِ السَّاعَةِ أَيَّانَ مُرْسِمُهَا قُلْ إِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّي لَا يُجِيبُهُ الْوَهْمُ وَلَا يُنْقَلُ فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ لَا تَأْتِيكُمُ إِلَّا بَغْتَةً يَتَسَوَّوْنَ كَأَنَّكَ حَفِيفٌ عَنْهَا قُلْ إِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ اللَّهِ وَلَكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ ﴿۱۸۷﴾

قُلْ لَا أَمْلِكُ لِنَفْسِي نَفْعًا وَلَا ضَرًّا إِلَّا مَا شَاءَ اللَّهُ وَلَوْ كُنْتُ أَعْلَمُ الْغَيْبِ لَاسْتَكْتَرْتُ مِنَ الْخَيْرِ وَمَا مَسَّنِيَ السُّوءُ إِنْ أَنَا إِلَّا نَذِيرٌ وَبَشِيرٌ لِّقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ ﴿۱۸۷﴾

(۱) سَاعَةٌ کے معنی گھڑی (لمحہ یا پل) کے ہیں۔ قیامت کو ساعتہ اس لیے کہا گیا ہے کہ یہ اچانک اس طرح آ جائے گی کہ پل بھر میں ساری کائنات درہم برہم ہو جائے گی یا سرعت حساب کے اعتبار سے قیامت کی گھڑی کو ساعتہ سے تعبیر کیا گیا ہے۔

(۲) أَرْسَىٰ يُرْسِي کے معنی اثبات و وقوع کے ہیں، یعنی کب یہ قیامت ثابت یا واقع ہو گی؟

(۳) یعنی اس کا یقینی علم نہ کسی فرشتے کو ہے نہ کسی نبی کو، اللہ کے سوا اس کا علم کسی کے پاس نہیں، وہی اس کو اپنے وقت پر ظاہر فرمائے گا۔

(۴) اس کے ایک دوسرے معنی ہیں۔ اس کا علم آسمان اور زمین والوں پر بھاری ہے، کیونکہ وہ مخفی ہے اور مخفی چیز دلوں پر بھاری ہوتی ہے۔

(۵) حَفِيفٌ کہتے ہیں پیچھے پڑ کر سوال کرنے اور تحقیق کرنے کو۔ یعنی یہ آپ ﷺ سے قیامت کے بارے میں اس طرح سوال کرتے ہیں کہ گویا آپ نے رب کے پیچھے پڑ کر اس کی بابت ضروری علم حاصل کر رکھا ہے۔

لوگوں کو جو ایمان رکھتے ہیں۔^(۱) (۱۸۸)

وہ اللہ تعالیٰ ایسا ہے جس نے تم کو ایک تن واحد سے پیدا کیا^(۲) اور اسی سے اس کا جوڑا بنایا^(۳) تاکہ وہ اس اپنے جوڑے سے انس حاصل کرے^(۴) پھر جب میاں نے بیوی سے قربت کی تو^(۵) اس کو حمل رہ گیا ہلکا سا۔ سو وہ

هُوَ الَّذِي خَلَقَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ وَجَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا لِيَسْكُنَ إِلَيْهَا فَلَمَّا تَغَشَّاهَا حَمَلَتْ حَمْلًا خَفِيًّا فَمَرَّتْ بِهِ فَلَمَّا أَثْقَلَتْ دَعَا اللَّهَ رَبَّهُمَا لَئِنْ آتَيْتَنَا صَالِحًا لَنُكَفِّرَنَّ مِنْ الشُّكُوبِ ۝

(۱) یہ آیت اس بات میں کتنی واضح ہے کہ نبی ﷺ عالم الغیب نہیں۔ عالم الغیب صرف اللہ کی ذات ہے۔ لیکن ظلم اور جمالت کی انتہا ہے کہ اس کے باوجود اہل بدعت آپ ﷺ کو عالم الغیب باور کراتے ہیں۔ حالانکہ بعض جنگوں میں آپ کے دندان مبارک بھی شہید ہوئے، آپ ﷺ کا چہرہ مبارک بھی زخمی ہوا، اور آپ ﷺ نے فرمایا کہ یہ قوم کیسے فلاح یاب ہوگی جس نے اپنے نبی کے سر کو زخمی کر دیا، کتب حدیث میں یہ واقعات بھی اور ذیل کے واقعات بھی درج ہیں) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر تہمت لگی تو آپ پورا ایک مہینہ سخت مضطرب اور نہایت پریشان رہے۔ ایک یہودی عورت نے آپ کی دعوت کی اور کھانے میں زہر ملا دیا، جسے آپ نے بھی تناول فرمایا اور صحابہ نے بھی، حتیٰ کہ بعض صحابہ تو کھانے کے زہر سے ہلاک ہی ہو گئے اور خود نبی ﷺ عمر بھر اس زہر کے اثرات محسوس فرماتے رہے۔ یہ اور اس قسم کے متعدد واقعات ہیں جن سے واضح ہے کہ آپ کو عدم علم کی وجہ سے تکلیف پہنچی، نقصان اٹھانا پڑا، جس سے قرآن کی بیان کردہ حقیقت کا اثبات ہوتا ہے کہ ”اگر میں غیب جانتا ہوتا تو مجھے کوئی مضرت نہ پہنچتی۔“

(۲) ابتدا یعنی حضرت آدم علیہ السلام سے۔ اسی لیے ان کو انسان اول اور ابوالبشر کہا جاتا ہے۔

(۳) اس سے مراد حضرت حوا ہیں، جو حضرت آدم علیہ السلام کی زوجہ بنیں۔ ان کی تخلیق حضرت آدم علیہ السلام سے ہوئی، جس طرح کہ منہا کی ضمیر سے، جو نفس واحدہ کی طرف راجع ہے، واضح ہے (مزید دیکھئے سورہ نساء آیت ۱، کا حاشیہ) (۴) یعنی اس سے اطمینان و سکون حاصل کرے۔ اس لیے کہ ایک جنس اپنے ہی ہم جنس سے صحیح معنوں میں مانوس اور قریب ہو سکتی ہے جو سکون حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے۔ قربت کے بغیر یہ ممکن ہی نہیں۔ دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا ﴿وَمِنْ آيَاتِهِ أَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِنْ أَنْفُسِكُمْ أَزْوَاجًا لِتَسْكُنُوا إِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَوَدَّةً وَرَحْمَةً﴾ (روم-۲۱) ”اللہ کی نشانیوں میں سے یہ بھی ہے کہ اس نے تمہارے لیے تم ہی میں سے (یا تمہاری جنس ہی میں سے) جوڑے پیدا کیے، تاکہ تم ان سے سکون حاصل کرو اور تمہارے درمیان اس نے پیار و محبت رکھ دی“ یعنی اللہ نے مرد اور عورت دونوں کے اندر ایک دوسرے کے لیے جو جذبات اور کشش رکھی ہے، فطرت کے یہ تقاضے وہ جوڑا بن کر پورا کرتے ہیں اور ایک دوسرے سے قرب و انس حاصل کرتے ہیں۔ چنانچہ یہ واقعہ ہے کہ جو باہمی پیار میاں بیوی کے درمیان ہوتا ہے وہ دنیا میں کسی اور کے ساتھ نہیں ہوتا۔

(۵) یعنی یہ نسل انسانی اس طرح بڑھی اور آگے چل کر جب ان میں سے ایک زوج یعنی میاں بیوی نے ایک دوسرے سے قربت کی۔ تَغَشَّاهَا کے معنی بیوی سے ہم بستری کرنا ہیں۔ یعنی وطی کرنے کے لیے ڈھانپنا۔

اس کو لئے ہوئے چلتی پھرتی رہتی،^(۱) پھر جب وہ بو جھل ہو گئی تو دونوں میاں بیوی اللہ سے جو ان کا مالک ہے دعا کرنے لگے کہ اگر تو نے ہم کو صحیح سالم اولاد دے دی تو ہم خوب شکر گزاری کریں گے۔^(۲) (۱۸۹)

سو جب اللہ نے دونوں کو صحیح سالم اولاد دے دی تو اللہ کی دی ہوئی چیز میں وہ دونوں اللہ کے شریک قرار دینے لگے،^(۳) سو اللہ پاک ہے ان کے شرک سے۔ (۱۹۰)

کیا ایسوں کو شریک ٹھہراتے ہیں جو کسی چیز کو پیدا نہ کر سکیں اور وہ خود ہی پیدا کئے گئے ہوں۔ (۱۹۱)

اور وہ ان کو کسی قسم کی مدد نہیں دے سکتے اور وہ خود بھی مدد نہیں کر سکتے۔ (۱۹۲)

اور اگر تم ان کو کوئی بات بتلانے کو پکارو تو تمہارے کہنے پر نہ چلیں^(۴) تمہارے اعتبار سے دونوں امر برابر ہیں خواہ تم ان کو پکارو یا تم خاموش رہو۔ (۱۹۳)

فَلَمَّا أَتَاهَا صَالِحًا جَعَلَا لَهُ شُرَكَاءَ فِيمَا آتَاهُمَا فَتَعَلَّىٰ اللَّهُ عَمَّآئِينَ يَنبُرُونَ ﴿۱۹﴾

أَيُّ شُرَكَائِهِمْ مَالًا يُغْنِي سَيِّئًا وَهُمْ يُخْلِفُونَ ﴿۲۰﴾

وَلَا يَسْتَطِيعُونَ لَهُمْ نَصْرًا وَلَا أَنفُسُهُمْ يَنْصُرُونَ ﴿۲۱﴾

وَإِنْ تَدْعُوهُمْ إِلَىٰ الْهُدَىٰ لَا يَتَّبِعُوكُمْ سَوَاءٌ عَلَيْهِمْ أَدْعَوْتُمُوهُمْ أَمْ أَنْتُمْ صَاغِتُونَ ﴿۲۲﴾

(۱) یعنی حمل کے ابتدائی ایام میں حتیٰ کہ نطفے سے علقۃ اور علقۃ سے مُضغۃ بننے تک، حمل خفیف ہی رہتا ہے، محسوس بھی نہیں ہوتا اور عورت کو زیادہ گرانی بھی نہیں ہوتی۔

(۲) بو جھل ہو جانے سے مراد، جب بچہ پیٹ میں بڑا ہو جاتا ہے تو جوں جوں ولادت کا وقت قریب آتا جاتا ہے، والدین کے دل میں خطرات اور توہمات پیدا ہوتے جاتے ہیں (بالخصوص جب عورت کو اٹھرا کی بیماری ہو) تو انسانی فطرت ہے کہ خطرات میں وہ اللہ کی طرف رجوع کرتا ہے، چنانچہ وہ دونوں اللہ سے دعائیں کرتے ہیں اور شکر گزاری کا عہد کرتے ہیں۔

(۳) شریک قرار دینے سے مراد یا تو بچے کا نام ایسا رکھنا ہے، مثلاً امام بخش، پیراں دتہ، عبد شمس، بندہ علی، وغیرہ، جس سے یہ اظہار ہوتا ہو کہ یہ بچہ فلاں بزرگ، فلاں پیر کی (نعوذ باللہ) نظر کرم کا نتیجہ ہے۔ یا پھر اپنے اس عقیدے کا اظہار کرے کہ ہم فلاں بزرگ یا فلاں قبر پر گئے تھے جس کے نتیجے میں یہ بچہ پیدا ہوا ہے۔ یا کسی مردہ کے نام کی نذر نیا زدے یا بچے کو کسی قبر پر لے جا کر اس کا ماتھا وہاں نکائے کہ ان کے طفیل بچہ ہوا ہے۔ یہ ساری صورتیں اللہ کا شریک ٹھہرانے کی ہیں، جو بد قسمتی سے مسلمان عوام میں بھی عام ہیں۔ اگلی آیات میں اللہ تعالیٰ شرک کی تردید فرما رہا ہے۔

(۴) یعنی تمہاری بتلائی ہوئی بات پر عمل نہیں کریں گے۔ ایک دوسرا مفہوم اس کا یہ ہے کہ اگر تم ان سے رشد و ہدایت طلب کرو، تو وہ تمہاری بات نہیں مانیں گے، نہ تمہیں کوئی جواب ہی دیں گے (فتح القدر)

واقعی تم اللہ کو چھوڑ کر جن کی عبادت کرتے ہو وہ بھی تم ہی جیسے بندے ہیں^(۱) سو تم ان کو پکارو پھر ان کو چاہئے کہ تمہارا کہنا کر دیں اگر تم سچے ہو۔ (۱۹۳)

کیا ان کے پاؤں ہیں جن سے وہ چلتے ہوں یا ان کے ہاتھ ہیں جن سے وہ کسی چیز کو تھام سکیں، یا ان کی آنکھیں ہیں جن سے وہ دیکھتے ہوں، یا ان کے کان ہیں جن سے وہ سنتے ہیں^(۲) آپ کہہ دیجئے! تم اپنے سب شرکا کو بلا لو، پھر میری ضرر رسانی کی تدبیر کرو پھر مجھ کو ذرا مہلت مت دو۔ (۱۹۵)^(۳)

یقیناً میرا مددگار اللہ تعالیٰ ہے جس نے یہ کتاب نازل فرمائی اور وہ نیک بندوں کی مدد کرتا ہے۔ (۱۹۶)
اور تم جن لوگوں کی اللہ کو چھوڑ کر عبادت کرتے ہو وہ تمہاری کچھ مدد نہیں کر سکتے اور نہ وہ اپنی مدد کر سکتے ہیں۔ (۱۹۷)^(۴)

إِنَّ الَّذِينَ تَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ عِبَادٌ أَمْثَلُكُمْ قَادَعُوهُمْ فَلَيسَ لَكُمْ بِهِمْ قُوَّةٌ ۚ كُنْتُمْ ضَالِّينَ ۝۱۳

أَلَمْ أَرْجُلُ يَمْشُونَ بِهَا ۚ أَمْ أَمْثَلُكُمْ أَيْدِي بَيْطُوتُونَ بِهَا ۚ أَمْ أَمْثَلُكُمْ أَعْيُنٌ يُبْصِرُونَ بِهَا ۚ أَمْ أَمْثَلُكُمْ أذَانٌ يَسْمَعُونَ بِهَا ۚ قُلْ ادْعُوا شُرَكَاءَكُمْ ثُمَّ كَيْدُونَ فَلَا تَنْظُرُونَ ۝۱۴

إِنَّ وِلِيَّ اللَّهِ الَّذِي نَزَّلَ الْكِتَابَ ۖ وَهُوَ يَتَوَكَّلُ الضَّالِّينَ ۝۱۵

وَالَّذِينَ تَدْعُونَ مِنْ دُونِهِ لَا يَسْتَطِيعُونَ نَصْرَكُمْ وَلَا أَنْفُسَهُمْ يَنْصُرُونَ ۝۱۶

(۱) یعنی جب وہ زندہ تھے۔ بلکہ اب تو تم خود ان سے زیادہ کامل ہو، اب وہ دیکھ نہیں سکتے، تم دیکھتے ہو۔ وہ سن نہیں سکتے، تم سنتے ہو۔ وہ کسی کی بات سمجھ نہیں سکتے، تم سمجھتے ہو۔ وہ جواب نہیں دے سکتے، تم دیتے ہو۔ اس سے معلوم ہوا کہ مشرکین، جن کی مورتیاں بنا کر پوجتے تھے، وہ بھی پہلے اللہ کے بندے یعنی انسان ہی تھے، جیسے حضرت نوح علیہ السلام کی قوم کے پانچ بتوں کی بابت صحیح بخاری میں صراحت موجود ہے کہ وہ اللہ کے نیک بندے تھے۔

(۲) یعنی اب ان میں سے کوئی چیز بھی ان کے پاس موجود نہیں ہے۔ مرنے کے ساتھ ہی دیکھنے، سننے، سمجھنے اور چلنے کی طاقت ختم ہو گئی۔ اب ان کی طرف منسوب یا تو پتھریا لکڑی کی خود تراشیدہ مورتیاں ہیں یا گنبد، قبے اور آستانے ہیں جو ان کی قبروں پر بنا لیے گئے اور یوں استخوان فروشی کا کاروبار فروغ پذیر ہے۔

اگرچہ پیر ہے آدم، جو ان ہیں لات و منات

(۳) یعنی اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو کہ یہ تمہارے مددگار ہیں تو ان سے کہو کہ میرے خلاف تدبیر کریں۔

(۴) جو اپنی مدد آپ کرنے پر قادر نہ ہوں، وہ بھلا دو سروں کی مدد کیا کریں گے؟

جو خود محتاج ہووے دوسرے کا
بھلا اس سے مدد کا مانگنا کیا

اور ان کو اگر کوئی بات بتلانے کو پکارو تو اس کو نہ سنیں^(۱) اور ان کو آپ دیکھتے ہیں کہ گویا وہ آپ کو دیکھ رہے ہیں اور وہ کچھ بھی نہیں دیکھتے۔ (۱۹۸)

آپ درگزر کو اختیار کریں^(۲) نیک کام کی تعلیم دیں^(۳) اور جاہلوں سے ایک کنارہ ہو جائیں۔^(۴) (۱۹۹)

اور اگر آپ کو کوئی وسوسہ شیطان کی طرف سے آنے لگے تو اللہ کی پناہ مانگ لیا کیجئے^(۵) بلاشبہ وہ خوب سننے والا خوب جاننے والا ہے۔ (۲۰۰)

یقیناً جو لوگ خدا ترس ہیں جب ان کو کوئی خطرہ شیطان کی طرف سے آجاتا ہے تو وہ یاد میں لگ جاتے ہیں سو

وَأَنْ تَدْعُوهُمْ إِلَى الْهُدَىٰ لَا يَتَّبِعُونَكُمْ وَيَنْظُرُونَ إِلَيْكُمْ وَهُمْ لَا يُبْصِرُونَ ﴿۱۹۸﴾

خُذِ الْعَفْوَ وَأْمُرْ بِالْعُرْفِ وَأَعْرِضْ عَنِ الْجَاهِلِينَ ﴿۱۹۹﴾

وَإِن يَسْتَعْزِمُكَ الشَّيْطَانُ نَزْعًا فَاسْتَعِذْ بِاللَّهِ إِنَّهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ﴿۲۰۰﴾

إِنَّ الَّذِينَ اتَّقَوْا إِذْ آمَتَهُمْ ظِلْفٌ مِنَ الشَّيْطَانِ تَدَكَّرُوا فَآذَاهُمْ مُبْصِرُونَ ﴿۲۰۱﴾

(۱) اس کا وہی مفہوم ہے جو آیت ۱۹۳ کا ہے۔

(۲) بعض علمائے اس کے معنی کیے ہیں خُذْ مَا عَفَاكَ مِنْ أَمْوَالِهِمْ أَي: مَا فَضَّلَ لِي عَنِ جَوَازِئِهِمْ لِيُحْتَسِبَ لِي فِيهَا مَالٌ لِي فِي يَوْمٍ أُخِرٍ (جو ضرورت سے زائد مال ہو، وہ لے لو) اور یہ زکوٰۃ کی فرضیت سے قبل کا حکم ہے۔ (فتح الباری، جلد ۸، ص ۳۰۵) لیکن دوسرے مفسرین نے اس سے اخلاقی ہدایت یعنی عفو و درگزر مراد لیا ہے اور امام ابن جریر اور امام بخاری وغیرہ نے اسی کو ترجیح دی ہے۔ چنانچہ امام بخاری نے اس کی تفسیر میں حضرت عمر رضی اللہ عنہما کا ایک واقعہ نقل کیا ہے کہ عیینہ بن حصن حضرت عمر رضی اللہ عنہما کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آکر ان پر تنقید کرنے لگے کہ آپ ہمیں نہ پوری عطا دیتے ہیں اور نہ ہمارے درمیان انصاف کرتے ہیں جس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہما غضب ناک ہوئے، یہ صورت حال دیکھ کر حضرت عمر رضی اللہ عنہما کے مشیر حزن قیس نے (جو عیینہ کے بھتیجے تھے) حضرت عمر رضی اللہ عنہما سے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی نبی ﷺ کو حکم فرمایا تھا۔ ﴿خُذِ الْعَفْوَ وَأْمُرْ بِالْعُرْفِ وَأَعْرِضْ عَنِ الْجَاهِلِينَ﴾ — درگزر کو اختیار کیجئے اور نیکی کا حکم دیجئے اور جاہلوں سے اعراض کیجئے۔ اور یہ بھی جاہلوں میں سے ہے۔ جس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہما نے درگزر فرمادیا۔ وَكَانَ وَقَافًا عِنْدَ كِتَابِ اللَّهِ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما اللہ کی کتاب کا حکم سن کر فوراً گردن خم کر دینے والے تھے۔ (صحیح بخاری۔ تفسیر سورة الأعراف) اس کی تائید ان احادیث سے بھی ہوتی ہے جن میں ظلم کے مقابلے میں معاف کر دینے، قطع رحمی کے مقابلے میں صلہ رحمی اور برائی کے بدلے احسان کرنے کی تلقین کی گئی ہے۔

(۳) عُرْفٌ سے مراد معروف یعنی نیکی ہے۔

(۴) یعنی جب آپ نیکی کا حکم دینے میں اتمام حجت کر چکیں اور پھر بھی وہ نہ مانیں تو ان سے اعراض فرمائیں اور ان کے جھگڑوں اور حماقتوں کا جواب نہ دیں۔

(۵) اور اس موقع پر اگر آپ کو شیطان اشتعال میں لانے کی کوشش کرے تو آپ اللہ کی پناہ طلب فرمائیں۔

یہ ایک ان کی آنکھیں کھل جاتی ہیں۔^(۱) (۲۰۱)
 اور جو شیاطین کے تابع ہیں وہ ان کو گمراہی میں کھینچنے لے
 جاتے ہیں پس وہ باز نہیں آتے۔^(۲) (۲۰۲)
 اور جب آپ کوئی معجزہ ان کے سامنے ظاہر نہیں کرتے تو وہ
 لوگ کہتے ہیں کہ آپ یہ معجزہ کیوں نہ لائے؟^(۳) آپ فرما
 دیجئے! کہ میں اس کا اتباع کرتا ہوں جو مجھ پر میرے رب کی
 طرف سے حکم بھیجا گیا ہے یہ گویا بہت سی دلیلیں ہیں
 تمہارے رب کی طرف سے اور ہدایت اور رحمت ہے ان
 لوگوں کے لئے جو ایمان رکھتے ہیں۔^(۴) (۲۰۳)
 اور جب قرآن پڑھا جایا کرے تو اس کی طرف کان لگا دیا کرو
 اور خاموش رہا کرو امید ہے کہ تم پر رحمت ہو۔^(۵) (۲۰۴)

وَإِخْوَانَهُمْ يُبْذَرُونَ فِي النَّارِ لَمْ يَلْقَوْهُمُ إِلَّا بِغَيْرِ كَيْدٍ ۖ

وَإِذَا لَمْ تَأْتِهِمْ بِآيَةٍ قَالُوا لَوْلَا اجْتَبَيْتَهَا قُلْ إِنَّمَا آتَيْتُكُمْ
 مَا يَأْتِي إِلَىٰ مِنْ رَبِّي هَذَا بَصَائِرُ مِنْ رَبِّكُمْ وَهُدًى
 وَرَحْمَةً لِّعِبَادٍ يَتُوبُونَ ۖ

وَإِذَا قُرِئَ الْقُرْآنُ فَاسْتَمِعُوا لَهُ وَأَنْصِتُوا لَعَلَّكُمْ
 تُرْحَمُونَ ۖ

(۱) اس میں اہل تقویٰ کی بابت بتلایا گیا ہے کہ وہ شیطان سے چونکنا رہتے ہیں۔ طائف یا طیف، اس تخیل کو کہتے ہیں جو
 دل میں آئے یا خواب میں نظر آئے۔ یہاں اسے شیطانی وسوسے کے معنی میں استعمال کیا گیا، کیونکہ وسوسہ شیطانی بھی
 خیالی تصورات کے مشابہ ہے۔ (فتح القدر)

(۲) یعنی شیطان کافروں کو گمراہی کی طرف کھینچنے لے جاتے ہیں، پھر وہ کافر (گمراہی کی طرف جانے میں) یا شیطان انکو لے
 جانے میں کوتاہی کمی نہیں کرتے۔ یعنی لَا يَفْصِرُونَ كَافِعًا لِّمَنْ يَكْفُرُ بِحَسْبِ الْكُفْرَانِ شَيْطَانٍ بَهِيمٍ
 (۳) مراد ایسا معجزہ ہے جو ان کے کہنے پر ان کی خواہش کے مطابق ظاہر کر کے دکھایا جائے۔ جیسے ان کے بعض مطالبات
 سورہ بنی اسرائیل، آیت ۹۰-۹۳ میں بیان کیے گئے ہیں۔

(۴) لَوْلَا اجْتَبَيْتَهَا کے معنی ہیں، تو اپنے پاس سے ہی کیوں نہیں بنانا؟ اس کے جواب میں بتلایا گیا کہ آپ فرمادیں،
 معجزات پیش کرنا میرے اختیار میں نہیں ہے میں تو صرف وحی الہی کا پیروکار ہوں۔ ہاں البتہ یہ قرآن جو میرے پاس آیا
 ہے، یہ بجائے خود ایک بہت بڑا معجزہ ہے۔ اس میں تمہارے رب کی طرف سے بصائر (دلائل و براہین) اور ہدایت و
 رحمت ہے۔ بشرطیکہ کوئی ایمان لانے والا ہو۔

(۵) یہ ان کافروں کو کہا جا رہا ہے جو قرآن کی تلاوت کرتے وقت شور کرتے تھے اور اپنے ساتھیوں کو کہتے تھے
 ﴿لَا تَسْمَعُوا هَذَا الْقُرْآنَ وَالْغَوْا فِيهِ﴾ (حلم السجدہ ۲۶) یہ قرآن مت سنو اور شور کرو، ان سے کہا گیا کہ اس کے
 بجائے تم اگر غور سے سنو اور خاموش رہو تو شاید اللہ تعالیٰ تمہیں ہدایت سے نواز دے۔ اور یوں تم رحمت الہی کے
 مستحق بن جاؤ۔

بعض ائمہ دین اسے عام مراد لیتے ہیں یعنی جب بھی قرآن پڑھا جائے، چاہے نماز ہو یا غیر نماز، سب کو خاموشی سے قرآن

اور اے شخص! اپنے رب کی یاد کیا کر اپنے دل میں عاجزی کے ساتھ اور خوف کے ساتھ اور زور کی آواز کی نسبت کم آواز کے ساتھ صبح اور شام اور اہل غفلت میں سے مت ہونا۔ (۲۰۵)

یقیناً جو تیرے رب کے نزدیک ہیں وہ اس کی عبادت سے تکبر نہیں کرتے اور اس کی پاکی بیان کرتے ہیں اور اس کو سجدہ کرتے ہیں۔ (۲۰۶)

سورہ انفال مدنی ہے اور اس کی بچھتر آیات اور دس رکوع ہیں

میں شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو نہایت مہربان بڑا رحم کرنے والا ہے
یہ لوگ آپ سے غنیمتوں کا حکم دریافت کرتے ہیں،^(۱)

وَأَذْكُرُ رَبَّكَ فِي نَفْسِكَ تَضَرُّعًا وَخِيفَةً وَدُونَ
الْجَهْرِ مِنَ الْقَوْلِ بِالْغُدُوِّ وَالْآصَالِ وَلَا تَكُنْ
مِنَ الْغَافِلِينَ ۝

إِنَّ الَّذِينَ عِنْدَ رَبِّكَ لَا يَسْتَكْبِرُونَ عَنْ عِبَادَتِهِ
وَيَسْبِغُونَ لَهُ وَيَمْجُدُونَ ۝

سُورَةُ الْأَنْفَالِ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ ۝

يَسْأَلُونَكَ عَنِ الْأَنْفَالِ قُلِ الْأَنْفَالُ لِلَّهِ وَالرَّسُولِ فَأَتَقُوا

سننے کا حکم ہے اور پھر وہ اس عموم سے استدلال کرتے ہوئے جہری نمازوں میں مقتدی کے سورہ فاتحہ پڑھنے کو بھی اس قرآنی حکم کے خلاف بتاتے ہیں۔ لیکن دوسرے علما کی رائے یہ ہے کہ جہری نمازوں میں امام کے پیچھے سورہ فاتحہ پڑھنے کی تاکید نبی ﷺ سے صحیح احادیث سے ثابت ہے۔ ان کے نزدیک اس آیت کو صرف کفار کے متعلق ہی سمجھنا صحیح ہے، جیسا کہ اس کے مکی ہونے سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ لیکن اگر اسے عام سمجھا جائے تب بھی اس عموم سے نبی ﷺ نے مقتدیوں کو خارج فرما دیا اور یوں قرآن کے اس عموم کے باوجود جہری نمازوں میں مقتدیوں کا سورہ فاتحہ پڑھنا ضروری ہوگا۔ کیونکہ قرآن کے اس عموم کی یہ تخصیص صحیح و قوی احادیث سے ثابت ہے۔ بنا بریں جس طرح اور بعض عموماً قرآنی کی تخصیص احادیث کی بنیاد پر تسلیم کی جاتی ہے، مثلاً آیت ﴿الزَّيْنَةُ وَالزَّيْنُ فَلْيُجْلِدُوا﴾ (النور: ۳) کے عموم سے شادی شدہ زانی کا اخراج، اور (السارق والسارقة) کے عموم سے ایسے چور کا اخراج یا تخصیص جس نے ربع دینار سے کم مالیت کی چیز چوری کی ہو یا چوری شدہ چیز، حرز میں نہ رکھی ہو۔ وغیرہ۔ اسی طرح ﴿فَأَسْتَمِعُوا لَهُ وَأَكْبَسُوا﴾ کے عمومی حکم سے مقتدی خارج ہوں گے اور ان کے لیے جہری نمازوں میں بھی سورہ فاتحہ کا پڑھنا ضروری ہوگا، کیونکہ نبی ﷺ نے اس کی تاکید فرمائی ہے (جیسا کہ سورہ فاتحہ کی تفسیر میں یہ احادیث بیان کی گئی ہیں)

(۱) أَنْفَالٌ، نَفْلٌ کی جمع ہے جس کے معنی زیادہ کے ہیں، یہ اس مال و اسباب کو کہا جاتا ہے، جو کافروں کے ساتھ جنگ میں ہاتھ لگے، جسے غنیمت بھی کہا جاتا ہے اسے نفل (زیادہ) اس لیے کہا جاتا ہے کہ یہ ان چیزوں میں سے ایک ہے جو پچھلی امتوں پر حرام تھیں۔ یہ گویا امت محمدیہ پر ایک زائد چیز حلال کی گئی ہے یا اس لیے کہ یہ جس کے اجر سے (جو آخرت میں ملے گا) ایک زائد چیز ہے جو بعض دفعہ دنیا میں ہی مل جاتی ہے۔